ربیع الاوّل۔ جمادی الاولیٰ ۱۴۴۳ھ
اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۲۱ء

سہ ماہی

حکمت قرآن

لاہور

مؤسس: ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ
مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

داعیٔ رجوع الی القرآن بانیٔ تنظیم اسلامی

محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

بیانُ القرآن

ترجمہ و مختصر تفسیر

اب دو انداز سے دستیاب ہے

- خوبصورت ٹائٹل
- عمدہ سفید کاغذ
- معیاری طباعت

1 2935 صفحات پر مشتمل، سات جلدوں میں

(الگ الگ جلدیں بھی دستیاب ہیں!)

مکمل سیٹ کی قیمت: 4800 روپے

2 متعدد اضافی خوبیوں کا حامل، طبع جدید

- قرآنی رسم الخط
- تفسیری سائز
- مضبوط ریگزین جلد

2560 صفحات پر مشتمل، چار جلدوں میں

مکمل سیٹ کی قیمت: 4800 روپے

مکتبہ خُدّام القرآن لاہور

K-36، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)

اِس شمارے میں

حرفِ اوّل

ایمانی نقطۂ نظر اور دانشورانہ خیال آرائی	ڈاکٹر ابصار احمد	3

یادِ رفتگاں

مختار حسین فاروقی رحمۃ اللہ علیہ	ڈاکٹر عارف رشید	11

تذکّر و تدبّر

مِلاکُ التأویل (۲۷)	ابوجعفر احمد بن ابراہیم الغرناطی	13

فہمُ القرآن

ترجمۂ قرآن مجید مع صرفی و نحوی تشریح	افاداتِ حافظ احمد یارؒ	25

بحث و نظر

جدید ریاست، مسائل اور امکانات	مکرم محمود	40

اسلام اور سائنس

سائنسی علوم کی ایک مثالی یونیورسٹی کی ضرورت (۲)	ڈاکٹر محمد رفیع الدّین	45

تعلیم و تعلّم

مباحثِ عقیدہ (۷، ۸)	مؤمن محمود	52

بیانُ القرآن

MESSAGE OF THE QURAN	Dr. Israr Ahmad	96

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ایمانی نقطۂ نظر اور دانشورانہ خیال آرائی

ڈاکٹر ابصار احمد

ہمارے ہاں دین وملّت سے وابستگی رکھنے والے حضرات قرآن وسُنّت اور اسلامی تہذیب کے حوالے سے اپنے اپنے فہم اور اپنے خیال میں اقرب اِلی السُّنّہ منہج کے مطابق مصروفِ عمل ہیں۔ ہم سب مانتے ہیں کہ اسلام عقائد' عبادات' اخلاقیات اور معاملات کا مربوط مجموعہ ہے۔ ہم اس اکائی اور وحدت کے حصّے بخرے نہیں کر سکتے۔ بصورتِ دیگر ہم قرآن کریم کی سورۃ البقرۃ میں وارد اس سخت وعید کا شکار ہو سکتے ہیں جو اہلِ یہود کو اس لیے دی گئی کہ ہدایتِ ربّانی کے کچھ حصّے کو مانتے اور دوسرے کو رد کرتے تھے۔ چنانچہ مسلمانوں کو نجات اور اخروی کامیابی کے لیے اسلام میں پورے طور پر یعنی مکمل اور ہمہ وجوہ داخل ہونے کا حکم ہے۔ کلامِ ربّانی کی راہنمائی انسانی فرد اور اجتماع دونوں کو محیط ہے۔ چنانچہ سیکولر فکر جو دین و مذہب کو فرد کے صرف عقائد' مراسمِ عبادت اور چند سماجی تقریبات تک محدود کرتی ہے' اس کا قرآن وسُنّت کے پیش کردہ دین سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان بنیادی مسلّمات ومشترکات کے بعد کچھ جزوی وفروعی معاملات کی تعبیر وتشریح میں البتہ ہمارے سماج میں بہت سی مختلف آراء اور زاویہ ہائے نگاہ پائے جاتے ہیں' جن میں سے بعض بہت Radical ہیں اور علمی اختلاف کو خلافیات تک بڑھا کر از حد غالی اور انتہا پسندی (extremism) کی حدود تک پہنچ جاتے ہیں۔ اور علماء' رجالِ دین اور مسلم تہذیبی شعور کے بارے میں بالعموم از حد منفی جذبات اور قنوطیت پسندی کا اظہار کرتے ہیں جو بہر حال پسندیدہ نہیں۔

ایسی ہی شخصیات میں سے ایک بلا کا طبّاع ذہن رکھنے والے اور وسیع مطالعہ کے حامل جناب محمد دین جوہر ہیں جن کے رشحاتِ قلم گزشتہ بیس پچیس سالوں سے علمی اور دقیق مضامین کی شکل میں قارئین کے مطالعے میں آرہے ہیں۔ تنظیم اسلامی اور مرکزی انجمن خُدام القرآن کے زیر انتظام گزشتہ ماہ پاکستان میں ''نفاذِ دینِ اسلام: کیا؟ کیوں؟ کیسے؟'' کے موضوع پر ۱۹ ستمبر کو قرآن آڈیٹوریم' گارڈن ٹاؤن لاہور میں سیمینار منعقد ہوا جس کی تفصیلی روداد ہفت روزہ ندائے خلافت میں شائع کی گئی اور شعبہ سمع و بصر نے اس کی ویڈیو افادۂ عام کے لیے بڑے اہتمام سے اپنی جملہ سوشل میڈیا/ ویب سائٹس پر اپ لوڈ کی۔ اس سیمینار پر ناقدانہ تبصرہ محمد دین جوہر صاحب نے ۲۴ ستمبر کو اپنے ''فیس بک وال'' پر دیا' جو مختصر ہونے کے باوجود اس اعتبار سے جامع ہے کہ اس میں جوہر صاحب کے دینی وعلمی افکار کا خلاصہ آ گیا ہے۔ چنانچہ قارئین حکمتِ قرآن کے لیے یہ ذیل میں من وعن

دیا جا رہا ہے۔ راقم اور عزیزم مکرم محمود نے اس کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے موصوف کی چند ماہ قبل ان کی ویب سائٹ پر آنے والی چند دقیق مبسوط تحریروں میں سے ایک بعنوان ''جدید ریاست اور ہماری خوش فہمیاں'' اور کچھ دوسری بھی سامنے رکھی ہیں' تاکہ قارئین کے لیے تمام نکات پورے سیاق وسباق کے ساتھ واضح ہو جائیں۔ سیمینار پر جناب محمد دین جوہر کا تبصرہ ملاحظہ کیجیے:

''یہ مقررین بڑے نیک اور متقی لوگ ہیں اور ان کی باتیں بہت اچھی ہیں۔ ان کے دل نور سے بھرے ہوئے ہیں' اور ذہن تارِ عنکبوت سے۔ میں نے دو گھنٹے دس منٹ ان کے مواعظ ثواب کے لیے سنے' آپ بھی ضرور سنیے۔ سیمینار کے عنوان میں مرکزی نقطہ ہے ''نفاذ''، اور نفاذ کا ہر مسئلہ عملی ہوتا ہے اور معاشرے اور تاریخ میں واقع ہو کر تہذیب کی تشکیل کی طرف پیش رفت کرتا ہے۔ یہ موضوع سیمینار سے خارج رہا ہے' کیونکہ گہری حالت انکار پر تشکیل شدہ مسلم شعور جدید معاشروں اور جدید تاریخ کا سامنا کرنے کی استعداد سے مطلقاً محروم ہو چکا ہے۔ نفاذ کا مسئلہ براہِ راست human agency اور اجتماعی ارادے سے مخاطب ہے' اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل کو نظری طور پر زیر بحث لاتا ہے۔ لیکن ہمارے اہلِ علم کا پسندیدہ مشغلہ دوسروں کے عقیدے کی تصحیح کرنا رہا ہے۔ یہاں تو ابھی عقیدے کی پُرجوش تصحیح ہو رہی ہے' آپ بھی کروائیے اور ثواب کمائیے۔ سیمینار کی ویڈیو دیکھنے کے بعد سے سوچ رہا ہوں کہ اس میں ظاہر شدہ ذہن تاریخ میں کوئی کردار ادا کرنے کے قابل رہا بھی ہے یا نہیں؟ سیمینار کا پورا عنوان ہے: ''پاکستان میں نفاذِ دین اسلام''۔ نفاذ کا جزوِ لاینفک سیاسی طاقت ہے' اور پورے دینِ اسلام کو محض نفاذ کی نظر سے دیکھنا ہمارے مذہبی ذہن کی مکمل rottenness کو ظاہر کرتا ہے۔ ہمارا دین ''امر'' کی مذہبی اور تہذیبی تشکیل کے جو ذرائع تاریخی اور روایتی طور پر سامنے لاتا رہا ہے اس سے یہ سیمینار مکمل حالت انکار میں ہے۔ ہمارا دین ''امر'' کی تشکیل افرادِ انسانی میں کرتا ہے' جدید ریاست اور عالمگیر سسٹم میں نہیں' اور ہمارا مذہبی سیاسی ذہن اس بنیادی دینی امتیاز سے بالکل ہی بے خبر ہے۔ ہمارا مذہبی سیاسی ذہن اس جبر کی تلاش میں ہے جس کی سیاسی تشکیل سعودی عرب اور ایران میں ہوئی ہے۔ ہمہ گیر وکُلّی سیاسی جبر مُلّا کا خواب ضرور ہے' پاکستانی عوام کی رؤیائے دینی نہیں ہے۔ پاکستانی عوام نے مذہبی سیاسی جماعتوں کے ایجنڈے کو مسترد کر کے تہذیبی فراست کا مظاہرہ کیا ہے۔''

جوہر صاحب سیمینار کی سوا دو گھنٹے کی تکنیکی اعتبار سے نہایت عمدہ ویڈیو ریکارڈنگ' شرکاء سے کھچا کھچ بھرا آڈیٹوریم' مقررین اور صدرِ مجلس کی خطابت' سامعین کا ڈسپلن کے ساتھ ہمہ تن گوش ہونا اور پورا ماحول (ambience and aura) دیکھ کر یقیناً متاثر و مسحور ہوئے ہوں گے۔ اے کاش ایسا ہوتا! لیکن یہاں تو معاملہ ہی مختلف اور برعکس ہے۔ اس موقع پر جناب حامد کمال الدین کے الفاظ میرے احساسات کی صحیح ترجمانی کرتے ہیں: ''مسلم دانش پر ایسا زوال بھی شاید ہی کبھی آیا ہو' نگاہ تک اپنی نہ رہی''۔ تبصرے کے بعض جملے نہایت بودے اور ہلکے محسوس ہوئے۔ یا شاید ان جملوں کا صحیح مفہوم پانے میں میرے ذہن کی نارسائی حائل ہو۔ یہ بھی ممکن ہے

کہ تبصرے کے وہ جملے امریکی فلسفی Daniel Dennett کے مطابق Deepities ہوں، یعنی ایسی تصدیقات جن کی تعبیر یا تفہیم دو مختلف انداز سے ہوسکتی ہو یا کسی مخصوص لفظ پر stress سے مفہوم کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے۔ بہرحال اس امکان کو تسلیم کرتے ہوئے بھی بادیٔ النظر میں درج ذیل کمنٹس دینی ذوق اور علمیت پر گراں گزرتے ہیں اور مسلم ethos کو چیلنج کرتے ہیں:

(i) آنجناب کا یہ کہنا کہ مقررین کے دل نور سے بھرے ہوئے ہیں اور ذہن تارعنکبوت سے، طنز وتعریض لیے بہت سخت جملہ ہے۔ دل اور ذہن کی ثنویت اور تناقض کو اس طرح اجاگر کرنا کچھ زیادہ مناسب نہیں۔ نور وہ روشنی ہے جس کی دعا قرآن اور ادعیہ ماثورہ میں کثرت سے ملتی ہے۔ ایک صحیح حدیث میں لوگوں کو مومن کی فراست سے ڈرنے کی تلقین کی گئی ہے کیونکہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔ یہاں ہمیں باطنی نور اور عقلی فہم وفراست میں دوئی نظر نہیں آتی، بلکہ دونوں میں گہرا ربط بتایا گیا ہے۔ اسلامی علمی روایت میں دل کے نور کو ذہن وعقل کی عیاریوں اور استدلال کی کٹ حجتیوں پر ہمیشہ فوقیت دی گئی ہے۔

(ii) ''.... مواعظ ثواب کے لیے سنے۔ آپ بھی سنیے''۔ وعظ وموعظت اور تذکیر ونصیحت کی ہمارے دین میں بڑی اہمیت ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ آج کل کے عقل گزیدہ ماحول میں کچھ عقلاء وفضلاء اس کی اہمیت کے قائل نہ ہوں۔ اس طویل مجلس کے مقررین نے قرآن کریم کی آیاتِ مبارکہ پڑھیں اور کثرت سے احادیث نبویہ و اقوال صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے سامعین کی تذکیر کا سامان کیا۔ چنانچہ یہ اس طرح ایک بابرکت محفل تھی جس سے مشابہ محفل کے بارے میں ایک صحیح حدیث میں بتایا گیا ہے کہ ایسی مجلس پر سکینت نازل ہوتی ہے، اللہ کی رحمت (شرکاء کو) گھیر لیتی ہے، فرشتے ان کے گرداگرد اکٹھے ہوتے ہیں اور اللہ ان کا ذکر اپنے مقرب (فرشتوں) میں کرتے ہیں۔ تصورِ ثواب کو تحقیر وتضحیک کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ایک سچے مسلمان کو اس میں کچھ بھی شک نہیں ہوتا کہ آخرت میں وزنِ اعمال اور باز پُرس کے وقت نیکیوں اور ثواب کی کرنسی ہی کام آئے گی۔ چنانچہ وہ دنیا کی آزمائشی زندگی میں چھوٹی سے چھوٹی نیکی اور اس کے اجر وثواب کے لیے بھی حریص ہوتا ہے۔

(iii) ۱۹ ستمبر کو منعقدہ اجتماع کو دیکھنے اور غور وفکر کا ایک اور زاویہ (perspective) بھی ہے جو میں فاضل مبصر کی خدمت میں پیش کرنے کی جسارت کروں گا۔ اور وہ حافظ ابن قیمؒ کی تصنیف ''الفوائد'' میں جلیل القدر صحابی رسول ﷺ فقیہ الامت حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے قول کی شکل میں ملتا ہے:

اطلب قلبک فی ثلاثة مواطن : عند سماع القرآن، وفی مجالس الذکر، وفی وقت الخلوة ، فان لم تجده فی هذه المواطن، فاعلم انه لا قلب لک فاسئل الله قلبًا آخر۔

ہمیں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ تین مواقع پر اپنے دل / قلب کو کھوجنے یا ٹٹولنے کی تاکید کرتے ہیں۔ یہ تین مواقع سماعِ تلاوتِ قرآن کریم، مجالس ذکر اور خلوت کے لمحات ہیں۔ اگر ہم اپنا دل ان جگہوں پر نہ پائیں تو

ہمیں چاہیے کہ ہم اللہ تعالیٰ سے احسان کرنے اور دل عطا کرنے کا سوال کریں‘ کیونکہ ہم اس سے محروم ہیں۔ دوسوا دو گھنٹے طویل سیمینار کی نشست‘ جیسا کہ سطور بالا میں عرض کیا گیا ہے‘ ہر معنی میں ایک مجلس ذکر تھی۔ چنانچہ زیر نظر روایت کی روشنی میں ہمیں دینی مجالس میں استماع شدہ مواد کو دل / قلب کی روشنی اور ہدایت کے لیے استعمال کرنا ہے‘ نہ کہ اس کو عقلی تحلیل و تجزیہ کی سان پر چڑھا کر تیا پانچا کرنا مطلوب ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت و تربیت سے فیض یافتہ ہیں۔ اس لیے ان کا قول مسلمانوں کے لیے از حد اہمیت کا حامل ہے‘ جس میں عقلی و منطقی جُورسی اور نکتہ آفرینی سے زیادہ قلب کی تاثیرات کو علمیاتی (epistemic) اعتبار سے زیادہ اہم‘ پُر حکمت اور مآل کار کے حوالے سے زیادہ با ثروت قرار دیا گیا ہے۔ نص قرآنی: ﴿سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى ۝۱۰﴾ (الاعلیٰ) ''جس کے دل میں اللہ کا خوف ہوگا وہ نصیحت مانے گا'' بھی اسی حقیقت کا بیان ہے۔

(iv) جوہر صاحب کے افکارِ عالیہ کا مرکزی نکتہ ''حالتِ انکار'' کا تھیسس ہے جو ان کے مفصل مضمون 'علم الکلام' تجدد اور جدیدیت'' میں پیش کیا گیا ہے۔ وہ مختصراً یہ ہے کہ جدیدیت‘ مابعد استعماریت‘ سائنس‘ مشین‘ مالیاتی نظام‘ آرگنائزیشن اور گلوبل سسٹم نے دنیا اور اس کے جملہ اداروں کو یکسر تبدیل کر کے ایک تحوّلِ عظیم برپا کر دیا ہے۔ ماضی سے انقطاع کے بعد خارجی سسٹم اور خود انسان میں جو ہری فرق واقع ہو چکا ہے جسے علمی سطح پر سمجھے بغیر ہم صرف علم دشمن رجحانات کو تقویت دیں گے۔ وہ لکھتے ہیں: ''جو چیز واقع میں ہمیں گھیر چکی ہے وہ ہمارے تہذیبی ذہن میں کسی بھی علمی شرط پر داخل نہیں ہے۔ یہ ایک انتہائی غیر معمولی صورت حال ہے جسے میں مسلم ذہن کی حالت انکار قرار دیتا ہوں۔''

رجالِ دین جنہوں نے دعوت و اقامتِ دین کے لیے محنت و تگ و دو کو اپنی مساعی کا محور بنایا ہے‘ کے بالمقابل جناب محمد دین جوہر نے اپنی صلاحیتوں اور اوقات کا کُل مصرف صرف علمائے دین اور شعوری سطح پر جینے والے مسلمانوں کو گہری حالت انکار سے نکال کر جدید عہد سے زندہ تعلق کی طرف لانا بنایا ہے۔ اس پراجیکٹ کے تحت وہ بزعم خویش آج کے زندہ مسائل سے تعرض کا کوئی منہج علمی دریافت کریں گے‘ کیونکہ علم الکلام کے قدیمی مباحث ان کی نظر میں اب مندرس اور پیش پا افتادہ ہیں۔

ناچیز کی رائے میں جوہر صاحب کا علمی مقدمہ ایسے بنیادی عناصر پر قائم ہے جو محل نظر ہیں اور اسی طرح ان کی کدو کاوش کا ہدف بھی ہماری تہذیبی علمی روایت سے مناسبت نہیں رکھتا۔ میرا احساس یہ ہے کہ وہ اتنی جاں گسل عقلی تگ و تاز کے مکلف نہیں ہیں۔ ہمارے دینی لٹریچر میں اسی کو تکلیف مالایطاق کہا جاتا ہے۔ یا شاید ایسے حقائق کے علم کی تلاش و جستجو جو ہم سے خالق کائنات نے محجوب رکھا ہے‘ اور ان کے لیے عقل کے گھوڑے دوڑانے سے ہمیں روک دیا گیا ہے۔ جوہر صاحب اپنی شدید ذہنی کاوش اور زورِ قلم کے بل پر اگر نام نہاد حکمت و عرفان کے کچھ جواہر پارے لوگوں کے سامنے پیش بھی کر دیں تو میرا خیال نہیں کہ اس سے وہ ہماری متوارث علمی و تہذیبی

روایت میں کوئی نمایاں اور مؤثر تحول لاسکیں گے۔ ہمارا ایمان ہے کہ قرآن وسُنّت کا دیا ہوا حق و باطل، شریعت اور علمی وعملی جہاد فی سبیل اللہ کا وہ بیانیہ (narrative) جو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین، حضرات تابعینؒ و تبع تابعین اور فقہائے اُمّت کی کاوشوں سے پورے تواتر کے ساتھ ہم تک منتقل ہوتا آیا ہے، تا قیامِ قیامت جاری رہے گا اور اس میں کوئی بڑی جوہری تبدیلی واقع نہیں ہوگی۔ علم الکلام کے وہ مسائل جن پر ہمارے متعدد اساطینِ دین نے شاندار تفصیلی و وضاحتی بیانیے تحریر کیے ہیں، کے متعلق آنجناب ارشاد فرماتے ہیں کہ ''وہ زندہ مسائل کے طور پر مسلمانوں میں موجود نہیں ہیں . . . . عصرِ حاضر میں ان کی کوئی relevance نہیں ہے . . . .اور ان پر گفتگو کرنا اپنا اور دوسروں کا وقت ضائع کرنا ہے۔'' اسی ترنگ میں وہ یہ انتہائی سطحی جملہ بھی لکھ جاتے ہیں: ''قدیم علم الکلام کے جدید فدائین ابھی تک یہ فیصلہ بھی نہیں کر سکے کہ مثلاً کلاسیکل علم الکلام اور جدید سائنس میں کارفرما عقل کے تصوّرات میں جوہری فرق کیا ہے؟'' یہ ججمنٹل انداز واضح طور پر صاحب مقالہ کے برخود غلط ہونے اور مکابرت کا آئینہ دار ہے۔ راقم تحدیثِ نعمت کے طور پر عرض کرتا ہے کہ اس نے گزشتہ ڈیڑھ برس کے دوران علم الکلام اور عقیدے کے مباحث پر قرآن اکیڈمی کے صاحب علم وفضل اساتذہ کے دروس سنتے ہوئے خود علیٰ وجہ البصیرت دیکھا ہے کہ یہ مباحث پوری طرح آج کے زندہ مسائل کی توضیح وتنقیح کر کے اہلِ سُنّت کے مجمع علیہ معتقدات نہایت جامع اور علمی انداز میں بیان کرتے ہیں اور ان کی relevance ہماری زوال پذیر ایمانی و اخلاقی صورت حال کے پیشِ نظر آج پہلے سے کہیں زیادہ متعلق، مفید اور معتبر ہے۔

(v) محمد دین جوہر اپنے مزاج اور کچھ 'روشنی طبع' کے تحت علم اور مباحث علم کو اپنے افکار کا کُل محور بنائے ہوئے ہیں۔ ان کی تحاریر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ساری ذہنی دنیا فقط علم اور علمی حرکیات کے گرد گھومتی ہے۔ وہ شاکی ہیں کہ جدید انسانی شعور داخل تہذیب اور بین التہذیب جن علمی حرکیات میں ظاہر ہوتا آیا ہے، ہمارے علماء اس سے بے خبر رہے ہیں اور آج بھی بے خبر ہیں۔ گزارش ہے کہ ہماری دینی تراث میں تصورِ علم جن وسیع معنوں میں استعمال ہوا ہے، جوہر صاحب کا التفات ادھر دکھائی نہیں دیتا۔ ان کے ہاں وہ صرف ذہنی ولسانی جمناسٹک کی طرح کا عمل لگتا ہے۔ اسلامی ڈسکورس میں سب سے بنیادی کام بندگیٔ رب ہے جس کے لیے اونچے درجے کا عالم فاضل ہونا ضروری نہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ انسان متمرد اور سرکش نہ ہو، اپنے آپ کو مخلوق اور اللہ کا بندہ سمجھتے ہوئے شکر، صبر اور استغفار پر عامل رہے۔ ایسا شخص یقیناً خیر کی پوزیشن پر ہے۔ علم کی باریکیوں کو سمجھنے اور اس میں درک پیدا کرنے کی بجائے اس کی زیادہ توجّہ دل کی بیماریوں پر مطلع ہونے اور ان کے تدارک سے ہوتی ہے۔ جوہر صاحب کے تصورِ علم میں احوال و اعمالِ قلوب، ادب، معصیتوں پر رونا اور آہ وزاری، درستگیٔ نیت اور استغفار بالکل بار نہیں پاتے۔ میں نے سطورِ بالا میں لکھا ہے کہ اس قبیل کے دانشوروں میں عموماً مسلمانوں کے حوالے سے یاسیت اور قنوطیت کا اظہار ملتا ہے۔ چنانچہ محمد دین جوہر بھی مسلم تہذیبی ذہن کو جدید گلوبل صورت حال سے تعرض نہ کرنے پر مکمل حالت انکار کا مجرم گردانتے اور لکھتے ہیں کہ ''مسلمان بہت تیزی سے شودرانِ عالَم کا

مقام حاصل کر رہے ہیں‘‘۔ لیکن کیا یہ مقامِ حیرت نہیں کہ انہی ’’شودرانِ عالَم‘‘ نے بیس سال کی سرفروشی اور مقاومت کے بعد عالمی سپر طاقت کو اپنے حواریوں اور لاؤلشکر سمیت افغانستان سے نکلنے پر مجبور کر دیا! ملّتِ اسلامیہ کی کمزوریوں اور امراض کا علاج

ع ’’سُوئے مادر آ کہ تیمارت کند!‘‘

کے مصداق صرف قرآن وسُنّت کی تعلیمات پر مبنی mother discourse کی طرف مراجعت میں ہے اور نئی نئی علمی موشگافیوں میں نہیں۔

❁❁❁

انجینئر مختار حسین فاروقیؒ: ایک صاحبِ عزیمت داعی

ماہ نامہ ’’حکمتِ بالغہ‘‘ کے خصوصی شمارے کے لیے جو محترم مختار فاروقی مرحوم کے بارے میں رفقاء احباب معتمدین اور اعزّہ کی تحریروں کا گلدستہ ہے‘ راقم کو بھی اپنے تاثرات اور یادیں قلم بند کرنے کی دعوت دی گئی۔ مرحوم کے ساتھ میرا تعلق دعوتی وتحریکی ہونے کے علاوہ قریبی عزیز داری کا بھی ہے‘ کہ وہ میری ہمشیرہ کے داماد تھے۔ اس طرح سے میں ان کی اہلیہ محترمہ کا ماموں ہوا۔ چنانچہ اس خاندانی قرابت داری کے سبب ان سے اکثر مواقع پر صادق آباد (جہاں اُن کا سسرال تھا) اور لاہور (جہاں تنظیم اسلامی کا مرکز ہے) میں ملنا ہوتا رہتا تھا۔ زندگی کی بے ثباتی اور موت کی اٹل حقیقت نے اب ہمارے درمیان جدائی پیدا کر دی ہے۔ ان شاء اللہ ہم ان سے حیاتِ اُخروی میں زیادہ بہتر حالات میں ملیں گے!

انگلستان سے ڈاکٹریٹ کے بعد واپسی پر (وسط ۱۹۷۳ء) جب راقم برادر مکرم ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے ساتھ ۱۲۔ افغانی روڈ‘ سمن آباد‘ لاہور میں مقیم ہوا تھا تو مختار فاروقی بھی سول انجینئرنگ کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد اپنی اولین ملازمت کے دوران اسی مکان کے بالائی پورشن میں کچھ عرصہ قیام پذیر رہے‘ اور یہ اُن کی شادی سے پہلے کی بات ہے۔ وہاں ہمارے بہنوئی مرحوم بھائی اللہ بخش سیال صاحب بھی گاہے ماہے آتے تھے۔ مختار فاروقی اس طرح تعارف اور ملاقاتوں کے بعد اُن کی دامادی میں آئے۔

فاروقی صاحب کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں۔ وہ تعلیمی لحاظ سے اور پروفیشنلی ایک سول انجینئر تھے۔ دین اور دعوتِ دین کی طرف پوری شدّت اور یک سوئی سے اس وقت مائل ہوئے جب انہوں نے انجینئرنگ یونیورسٹی میں تعلیم کے دوران ہی مؤسس مرکزی انجمن اور بانی تنظیم اسلامی کے دروسِ قرآن کی سماعت کا آغاز کیا۔ فرائض دینی کی انجام دہی کو انہوں نے ہمیشہ ملازمت یا کسی بھی دوسری معاشی مصروفیت پر ترجیح دی۔ پاکستان میں وہ جہاں بھی رہے‘ انہوں نے دعوتی وتحریکی کام تن دہی اور انتہائی خلوص سے کیا۔ چنانچہ ہر جگہ فعال شاگردوں کی شکل میں

ان کی مساعی کے نتائج سامنے آئے۔ تا آنکہ جب دو ہونہار اور سلیم الطبع بیٹوں نے تعلیم مکمل کر کے انہیں معاشی ذِمّہ داریوں سے آزاد کر دیا تو وہ گزشتہ ڈیڑھ دو دہائیوں سے ہمہ تن اور ہمہ وقت اپنے دینی استاد اور پیش رَو ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے فکرِ قرآنی کی تشہیر و اشاعت اور ان کی قائم کردہ تنظیم اسلامی کے تحت غلبۂ دین کی عملی جِدّوجُہد میں مصروفِ عمل رہے۔ تنظیم اسلامی کی مرکزی عاملہ اور مرکزی شوریٰ کے رکن ہونے کے علاوہ وہ تحریک خلافت کے ناظم اعلیٰ بھی رہے۔ چنانچہ ہر ماہ لاہور اور جھنگ کے درمیان ان کے کم از کم دو رحلات رہتے تھے۔ دعوتی و تدریسی مصروفیات کے ساتھ ساتھ اپنے علمی افق کو وسیع کرنے میں بھی فاروقی صاحب نے مسلسل جِدّوجُہد کی۔ برصغیر میں اردو میں شائع ہونے والی کتابوں کے علاوہ وہ یورپ اور امریکہ میں مؤیّدِ مذہب چھپنے والی کتابوں پر بھی نظر رکھتے تھے۔ اسی طرح کی طبع ہونے والی ایک کتاب Slouching Towards Gomorrah جو ۱۹۹۶ء میں امریکہ کے ایک سابق اٹارنی جنرل Robert H. Bork نے تصنیف کی' فاضل مصنف نے ۴۰۰ سے زائد صفحات پر مشتمل اس کتاب میں مغربی دنیا اور خاص طور پر امریکہ کے معاشرے کے اخلاقی زوال و پستی کی بھیانک صورت حال وضاحت سے پیش کی ہے' اور ساتھ اصلاحی اقدامات کے لیے ایک زوردار آواز (wake-up call) بلند کی ہے۔ اس کتاب کی فوٹو کاپی فاروقی صاحب نے مجھے بھی بھجوائی' جو میرے پاس بطور ایک یادگار تحفہ محفوظ ہے۔

اپنے دینی و فکری قائد کے منہج پر چلتے ہوئے آبائی شہر جھنگ میں مرحوم نے انجمن خُدّام القرآن کی بنیاد رکھی اور اس کے زیر انتظام قرآن اکیڈمی کی تعمیر کا آغاز بھی معمولی وسائل کے ساتھ کیا۔ یہ اکیڈمی اب اللہ کے فضل و کرم اور احباب و رفقاء کے مالی تعاون سے اچھے خاصے رقبہ پر دیگر تعمیرات کے ساتھ موجود ہے۔ ماضی میں جھنگ شیعہ سُنّی فرقہ وارانہ آویزش کے حوالے سے مشہور رہا ہے۔ ایسے ماحول میں قرآنی دعوت کا ایک ایسا مرکز قائم کرنا جس میں قرآن و سُنّت کی تفہیم ٹھوس علمی بنیادوں پر ہو' ایک اہم سنگ میل ہے۔ فرقہ پرستی اور تشتت کے بجائے اسلام کے اصل منبع و ماخذ اور اس کی بنیادوں کی طرف رجوع و التفات ہر اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے۔ فاروقی صاحب کی نمازِ جنازہ میں شرکاء کی کثیر تعداد سے اندازہ ہوا کہ جھنگ اور مضافات کے بالخصوص تعلیم یافتہ خواتین و حضرات میں ان کے اور باصلاحیت فعال ساتھیوں کے دروسِ قرآن اور جملہ دعوتی کاوشوں کا اثر و نفوذ پھیل رہا ہے۔ انجمن گاہے گاہے دینی و ملکی' سیاسی و علمی موضوعات پر سیمینارز کا اہتمام بھی کرتی رہی ہے' جس کے لیے ساری بھاگ دوڑ اور محنتِ شاقّہ مختار فاروقی صاحب نے کی۔ ان علمی مجالس میں لاہور' اسلام آباد اور دوسرے کئی شہروں سے اصحابِ علم و فضل نے حاضر ہو کر اپنے افکار و خیالات پیش کیے۔ یاد پڑتا ہے کہ کم از کم ایسے دو سیمینارز میں راقم نے بھی بعض موضوعات پر اپنا تجزیہ مقررین کے گوش گزار کیا۔ ان مجالس میں فاروقی صاحب کے استقبالی/کلیدی خطابات اسلام کے حوالے سے ان کے جذبات اور سوزِ دروں کے آئینہ دار ہوتے تھے۔ وہ علیٰ وجہ البصیرت عالمی صہیونی ابلیسی تہذیب کے شدید ناقد تھے۔ ان کی تقاریر میں نہ معذرت ہوتی اور نہ حقائق شکنی' بلکہ وہ علم و بصیرت سے لبریز ہوتیں۔

قرآن اکیڈمی جھنگ میں فاروقی صاحب نے ''پھر سوئے حرم لے چل'' کے عنوان سے ۲۵ روزہ تعلیمی و تربیتی پروگرام کا آغاز کئی برس قبل کیا' جن میں طلبہ ہمہ وقتی اور شاید کبھی جز وقتی قیام کر کے قرآن و حدیث اور دوسری اسلامی معلومات حاصل کرتے رہے۔ یہ پروگرام تھوڑے تھوڑے وقفے سے اب تک غالباً ڈیڑھ سو مرتبہ منعقد ہو چکے ہوں گے۔ مجھ ناچیز کی رائے میں انجمن خُدّام القرآن جھنگ کا یہ پروگرام اکیڈمی سے شائع ہونے والے جرائد یا مطبوعات سے زیادہ مثبت اور اسلامی تحریکی اعتبار سے زیادہ ثمر آور ہے۔ اگر ان پروگراموں کے شرکاء کے کوائف کا ریکارڈ رکھ کر بعد میں بھی ان سے رابطہ رکھا جائے تو مزید دینی و تحریکی جذبہ بڑھانے میں یہ follow-up مفید رہے گا۔ تنظیم اسلامی کی تربیتی ورک شاپس' علاقائی پروگراموں اور سالانہ اجتماعات میں بھی فاروقی صاحب کے خطابات ہمیشہ بہت مؤثر ہوتے تھے۔ وہ اسلامی تاریخ کے مختلف ادوار اور واقعات پر ماہرانہ اسلوب سے کلام کرتے تھے' جسے حاضرین بہت دلچسپی سے سنتے تھے۔ اپنی تقریروں اور تحریروں میں ہمیشہ شاعرِ مشرق علّامہ اقبالؒ کے اشعار کی مدد سے وہ سامعین اور قارئین کے دلوں میں حرارتِ ایمانی اور جذبہ عمل پیدا کرتے تھے۔

راقم اپنی علمی بے بضاعتی کے باوصف یہ سمجھتا ہے کہ بانی تنظیم ڈاکٹر اسرار احمدؒ (اور ان کے تتبع میں انجینئر مختار فاروقیؒ بھی آتے ہیں) کے فکر کے بعض فراموش کردہ پہلوؤں کی جانب التفات کر کے داعیانِ قرآن کے فکر اور مشن کو زیادہ روشن اور توانا (powerful) بنایا جا سکتا ہے۔ انجمن ہائے خُدّام القرآن کے اغراض و مقاصد میں سب سے بلند مقصد قرآن حکیم کے فلسفہ و حکمت کو وقت کی اعلیٰ ترین علمی سطح پر پیش کرنے کی سعی ہے۔ بحمد اللہ' بانیٔ تنظیم اور بعد ازاں ان کے بے شمار تلامذہ نے دروسِ قرآن' موضوعاتی تقاریر اور لٹریچر کے ذریعے باشعور اذہان میں جو اسلامی بیداری پیدا کر دی ہے اور جس علمی حرکت کو ان صاحبانِ عزیمت نے اکسایا ہے اسے کوئی طاقت بار آور ہونے سے نہیں روک سکتی۔ اس احیائی دینی فکر کو سطحیت اور جمود کا شکار ہونے سے بچانے کے لیے گہری دینی عرفانی بصیرت کے ساتھ عصرِ حاضر کے علمی و عقلی سطح کی ایسی تازگی و توانائی (rejuvenation) کی ضرورت ہے جو معاصر گلوبل حالات و افکار کا گہرا فہم و ادراک بھی رکھتی ہو۔ اس سلسلے میں انجمنوں اور اکیڈیمیز کو اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے لیے ایک اعلیٰ علمی تحقیقی و تدریسی ادارے کے طور پر علمی ممارست و فقاہت اور فکری تدوینِ نو کا کام کرنا ہے۔ اس دقت طلب کام میں علوم دینیہ کے اصل مراجع و مصادر کا گہری نظر سے مطالعہ از بس ضروری ہے۔ یہ ہدف مشکل تو ضرور ہے' لیکن اس کی ضرورت ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھتی جاتی ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مختار فاروقی صاحب کی خدمات کو شرفِ قبولیت اور فیضانِ عام بخشے۔ اللہ ان سے راضی ہو اور ان کی روح کو ابدی سکون سے ہم کنار کرے! ان کے صاحب زادگان اور رفقاء کو ان کے مشن کو صحیح خطوط پر آگے بڑھانے کی توفیق دے۔ آمین' ثم آمین!

❀❀❀

مختار حسین فاروقی رحمۃ اللہ علیہ

ازقلم: ڈاکٹر عارف رشید (صدر مرکزی انجمن خُدّام القرآن لاہور)

محترم مختار حسین فاروقی مرحوم ومغفور سے میرا پہلا تعارف غالباً ۷۰۔۱۹۶۹ء میں حاصل ہوا جبکہ وہ انجینئرنگ یونیورسٹی کے طالب علم تھے اور یونیورسٹی ہاسٹل ہی میں مقیم تھے۔ مرحوم کا والد محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ سے تعارف کا ذریعہ وہ دروسِ قرآن تھے جو والد محترم نے ۱۹۶۶ء میں لاہور منتقل ہوتے ہی لاہور شہر کے طول وعرض میں دینے شروع کیے تھے۔ مرحوم فاروقی صاحب یونیورسٹی ہاسٹل سے سائیکل پر سوار ہوکر کرشن نگر (موجودہ اسلام پورہ) میں واقع ہمارے گھر آتے اور ابّی جانؒ کے کلینک میں فارغ اوقات کے دوران قرآن حکیم اور عربی کا علم حاصل کرتے۔

۱۹۷۲ء میں مرکزی انجمن قائم ہوئی اور والد محترمؒ سمن آباد منتقل ہوگئے۔ ۱۲ افغانی روڈ سمن آباد ایک کنال پر محیط ایک پرانی تعمیر شدہ عمارت تھی جو ظہیر احمد خان مرحوم کی ملکیت تھی اور موصوف والد محترمؒ کے دروس سے متاثر ہوکر انجمن کے تاسیسی رکن بھی بنے اور انہوں نے اپنا یہ بنگلہ انجمن کے مرکزی دفتر اور والد محترمؒ کی رہائش کے لیے بغیر کرایہ مختص کر دیا تھا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ یہ ایام فاروقی صاحب مرحوم کے انجینئرنگ کی تعلیم کے آخری ایک ڈیڑھ سال کے تھے۔ محترم فاروقی صاحب ابّی جان کے مشورے پر انجینئرنگ یونیورسٹی کا ہاسٹل چھوڑ کر مرکزی انجمن کے دفتر ۱۲ افغانی روڈ سمن آباد کے Top Floor جس میں چند کمرے اور ایک بڑا ہال روم تھا، منتقل ہوگئے تھے۔ ٹاپ فلور کے اس بڑے کمرے میں روزانہ شام کے اوقات میں عربی گرامر اور قرآن فہمی کی کلاسز ہوتی تھیں، جہاں اس وقت کے واحد مدرّس جناب ڈاکٹر اسرار احمدؒ شام کے اوقات میں تدریس فرماتے تھے۔ اس عمارت کی وسیع چھت پر ہم نے بیڈمنٹن کا کورٹ بنالیا تھا جہاں ہم دو بھائی (راقم اور برادرم عاکف)، مختار حسین فاروقی صاحب، قمر سعید قریشی صاحب (سابقہ ناظم اعلیٰ مرکزی انجمن) اور ڈاکٹر نسیم الدین خواجہ صاحب مرحوم ومغفور تعلیمی پروگرام زاور نماز عشاء سے فارغ ہوکر ایک ڈیڑھ گھنٹہ بیڈمنٹن کھیلتے تھے۔ برادرم فاروقی صاحب مرحوم کو کھیل سے دلچسپی نہیں تھی، اور وہ اس دوران یا تو ہمارے کھیل کو دیکھتے ہوئے انجوائے کرتے تھے یا اسی دوران کتب بینی میں مصروف رہتے تھے۔

قابلِ احترام فاروقی صاحب کی دینی خدمات اور دین کے غلبہ کے لیے اُن کی کمٹمنٹ اور خلوص کے حوالے سے ندائے خلافت اور میثاق میں بہت کچھ لکھا جاچکا ہے۔ اُس میں ع ''یہ رتبہ بلند جس کو مل گیا'' کے مصداق

میں کیا اضافہ کروں گا‘ لیکن میری یادداشت میں چند نقوش جو اُن کی نوجوانی کے دور کے تھے‘ انہی کے بیان پر اکتفا کر رہا ہوں۔

اگست ۱۹۷۲ء میں سنٹرل ماڈل اسکول سمن آباد میں ایک دس روزہ اقامتی تربیت گاہ منعقد ہوئی تھی جس کے روحِ رواں جناب فاروقی صاحب تھے۔ وہ میرا ہائی اسکول کا زمانہ تھا۔ اس تربیت گاہ کی بھی بہت سی یادیں میرے لوحِ ذہن میں محفوظ ہیں جن میں فجر سے قبل تہجد کے لیے اٹھنا‘ بعد فجر درسِ حدیث کا پروگرام‘ ناشتے کے بعد سے نماز ظہر تک تعلیمی و تربیتی پروگرام اور عصر تا عشاء مسجد خضراء میں والد محترمؒ کے دروسِ منتخب نصاب اور بعد نمازِ عشاء اور عشائیہ ’’بزمِ ادب‘‘ کی محافل وغیرہ شامل تھیں۔ اس تربیت گاہ کے عوامی پروگرام مسجد خضراء سمن آباد میں بعد نماز عصر تا عشاء والد محترمؒ کے قرآن حکیم کے منتخب نصاب کے دروس کی شکل میں ہوتے تھے اور مسجد خضراء کے نواح میں رہائش پذیر حضرات بڑے ذوق وشوق کے ساتھ ان پروگرامز میں شریک ہوتے تھے۔ نماز عصر سے ایک ڈیڑھ گھنٹہ قبل مسجد خضراء ہی میں قاری عبدالرحمٰن تونسوی مرحوم تجوید و قراءت کی کلاس لیتے تھے اور قبل عصر مولانا عبدالغفار حسن مرحوم و مغفور جو جماعت اسلامی کے صف اول کے شرکاء میں سے تھے‘ درسِ حدیث دیا کرتے تھے۔

فاروقی صاحب مرحوم نے راقم سے ایک وعدہ لیا تھا کہ قرآن اکیڈمی جھنگ کی مسجد میں ایک خطابِ جمعہ میرے ذِمّہ ہوگا۔ جب اُس وعدے کی تکمیل کا وقت آیا تو دو تین دن قبل انہوں نے کہا کہ آپ کا خطاب ۱۱ بجے قبل جمعہ شروع ہوگا اور پونے دو گھنٹے تک یعنی ٹھیک ۱۲:۴۵ تک جاری رہے گا۔ خطابِ جمعہ کے حوالہ سے ۳۰۔۴۰ منٹ کے خطاب کے لیے تو تیار تھا لیکن پونے دو گھنٹے اور وہ بھی خطاب جمعہ کے عنوان سے —— جمعۃ المبارک سے ایک روز قبل جب میرے علم میں آیا کہ میں نے سورۃ الشعراء کے آخری دو رکوع کا درس دینا ہے‘ تو جان میں جان آئی اور ظاہر ہے کہ پھر یہ ذِمّہ داری ادا بھی کی۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کی قبر تا حدِ نگاہ وسیع فرمائے‘ اپنے نور سے بھر دے اور اُسے جنت کے باغات میں سے ایک باغیچہ بنا دے۔ اور اُن کے دونوں بیٹوں کو اپنے والد محترم کے اُس خواب کو جو مرحوم نے قرآن اکیڈمی جھنگ کی شکل میں دیکھا تھا اور اس ضمن میں بعض پروجیکٹس بھی ان کے پیشِ نظر تھے‘ پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یا ربّ العالمین!!

❁❁❁

اپنے ذاتی اوقات میں سے کم از کم نصف گھنٹہ نکال کر
’’بیان القرآن‘‘ کے ترجمہ و ترجمانی کا ضرور مطالعہ کریں‘
آپ یقیناً مستفید ہوں گے۔ (ان شاء اللہ!)

مِلاکُ التأوِیل (۲۷)

تالیف: ابوجعفر احمد بن ابراہیم بن الزبیر الغرناطی
تلخیص وترجمانی: ڈاکٹر صہیب بن عبدالغفار حسن

سُورۃ یونس

(۱۶۵) آیت ۴۷

﴿وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولٌ ۚ فَإِذَا جَاءَ رَسُولُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُم بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿٤٧﴾﴾

''اور ہر اُمّت کے لیے ایک رسول ہے' اور جب ان کا رسول آجاتا ہے تو ان کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جاتا ہے اور ان پر ظلم نہیں کیا جاتا۔''

اور پھر اسی سورت کی آیت ۵۴ میں کہا گیا:

﴿وَأَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَأَوُا الْعَذَابَ ۚ وَقُضِيَ بَيْنَهُم بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿٥٤﴾﴾

''اور انہوں نے جب عذاب کو دیکھا تو پشیمانی کو چھپایا' اور ان کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا گیا اور ان پر ظلم نہیں کیا گیا۔''

اور سورۃ الزمر میں ارشاد فرمایا:

﴿وَجِيءَ بِالنَّبِيِّينَ وَالشُّهَدَاءِ وَقُضِيَ بَيْنَهُم بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿٦٩﴾﴾

''اور نبیوں کو اور شہداء کو لایا گیا اور ان کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر دیا گیا اور ان پر ظلم نہیں کیا گیا۔''

اور اسی سورت کے آخر میں ارشاد فرمایا:

﴿وَتَرَى الْمَلَائِكَةَ حَافِّينَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُونَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ ۚ وَقُضِيَ بَيْنَهُم بِالْحَقِّ وَقِيلَ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿٧٥﴾﴾

''اور تم فرشتوں کو دیکھتے ہو کہ وہ عرش کے گرد حلقہ بند ہیں' اپنے رب کی حمد اور تسبیح میں لگے ہوئے ہیں' اور ان کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر دیا گیا اور کہا گیا کہ ساری تعریف اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کو پالنے والا ہے۔''

ملاحظہ ہو کہ سورۂ یونس کی دونوں آیتوں میں ''بِالْقِسْطِ'' کے الفاظ ہیں اور سورۃ الزمر کی دونوں آیتوں میں ''بِالْحَقِّ'' کے الفاظ ہیں تو اس فرق کی وجہ کیا ہے؟

ہمارے خیال میں اس کی وجہ یہ ہے کہ ''قسط'' سے مراد انصاف ہے اور فیصلہ کرنے میں مساوات کا خیال کرنا ہے۔ اور یہ لفظ وہاں آتا ہے جہاں اعمال کی جزا کا ذکر ہے' یعنی بدلہ دیا جائے گا لیکن پورا پورا' بغیر کسی اضافے کے۔ جیسا کہ کُفّار کے اعمال کی جزا کے بارے میں ارشاد فرمایا: ﴿جَزَآءً وِّفَاقًا ۝۲۶﴾ (النبا) یعنی ''ان کو پورا پورا بدلہ ملے گا'' جو اُن کے اعمال کے مطابق ہوگا' اس لیے کہ اللہ کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ اور جہاں لفظ ''حق'' آیا ہے تو ''حق'' سے مراد صدق ہے اور یہ لفظ وہاں آیا ہے جہاں کسی وعید کی سچائی بیان کرنا مقصود ہو یا کسی آنے والی چیز کی خبر دینا مقصود ہو۔ جیسے کہ یہ بتانا کہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان سے بغیر کسی حساب کے بے انتہا اجر و ثواب کا وعدہ کیا ہے اور یہ کہ ان کے اچھے اعمال کی جزا میں برابری کا خیال نہیں رکھا جائے گا' بلکہ ان کی امید سے زیادہ دیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ﴿اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝۱۰﴾ (الزمر) ''بے شک صبر کرنے والوں کو ان کا اجر بے حساب دیا جائے گا۔'' اور ارشاد فرمایا: ﴿وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ۝۵۸﴾ (البقرۃ) ''اور ہم نیکی کرنے والوں کو اور زیادہ دیں گے۔'' اور ارشاد فرمایا: ﴿فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ﴾ (النساء: ۱۷۳) ''اور جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال کیے تو اللہ ان کا اجر پورا پورا دے گا اور اپنے فضل سے اور زیادہ دے گا۔'' اور پھر اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ کہ وہ ایک نیکی کا بدلہ دس گنا دے گا' اور اس موضوع پر کتاب و سُنّت میں بہت کچھ بیان ہوا ہے۔

اب سورۃ الزمر کی آیت ملاحظہ ہو جہاں انبیاء اور شہداء کے لائے جانے اور پھر حق کے ساتھ ان کے درمیان فیصلہ کیے جانے کا ذکر ہے' اور ایسے ہی دوسری آیت میں جہاں فرشتوں کی حمد و ثنا کا ذکر کیا گیا وہاں بھی حق کے ساتھ فیصلہ کیا جانے کا ذکر ہے۔ اور یہ جو الفاظ ہیں: ﴿قُضِيَ بَيْنَهُمْ﴾ تو اس سے مراد انبیاء و شہداء تو ہیں ہی لیکن عامۃ الخلق بھی مراد لیے جا سکتے ہیں۔ اور پھر مطلب یہ ہوگا کہ سب کے مابین فیصلہ حق کے ساتھ ہوگا۔ اگر اہلِ ایمان ہیں تو انہیں وعدۂ الٰہی کے مطابق نہ صرف انصاف ملے گا بلکہ ان کے اجر و ثواب میں اضافہ بھی کیا جائے گا' اور جو کفر پر قائم رہے تو انہیں بھی اپنے اعمال کے مطابق بدلہ دیا جائے گا۔ یعنی ان کا معاملہ قسط یعنی برابر سرابر رہے گا' جیسے اعمال ویسی ہی سزا' نہ زیادہ نہ کم۔

اور جہاں تک سورۂ یونس کی دونوں آیات کا تعلق ہے' تو پہلی آیت سے قبل کئی ایسی آیات ہیں جن میں کُفّارِ قریش کے عناد اور تکبّر کا بیان ہے اور نبی ﷺ کو جھٹلانے کا ذکر ہے۔ گویا رسول اللہ ﷺ کو تسلی دی جا رہی ہے۔ پھر یہاں تک کہا گیا:

﴿وَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ اللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ ۝۴۶﴾

''اور یا تو ہم آپؐ کو کچھ ایسی چیزیں دکھا دیں گے جن کا ہم نے ان سے وعدہ کیا ہے یا آپ کو وفات دے دیں گے تو پھر ہماری طرف ہی وہ لوٹ کر آئیں گے' اور پھر اللہ ان کے تمام کرتوتوں پر گواہ ہے۔''

اور پھر قیامت کے دن جب رسول کو حاضر کیا جائے گا' تو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ انہوں نے جس رسول کو جھٹلایا تھا وہ تو اعزاز و اکرام سے مالا مال ہے' اور وہ خود ذلّت و خواری کا سامنا کر رہے ہیں' تو پھر وہ اللہ تعالیٰ کے عدل و انصاف کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔ یہاں فریقین (ایک صادق اور دوسرا کاذب) کے ساتھ انصاف کیا جائے گا اور اسی لیے یہاں ''بِالْقِسْطِ'' کا لفظ لایا گیا۔

سورۂ یونس کی دوسری آیت میں بھی کُفّار کا ذکر ہے' عذاب دیکھنے پر اپنی پشیمانی کو چھپانے کا ذکر ہے اور پھر ''قِسط'' یعنی انصاف کے ساتھ ان کے مابین فیصلے کا ذکر ہے' تو یہاں ''بِالْحق'' کا لفظ لانے کا موقع نہ تھا جیسا کہ پہلے تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے' واللہ اعلم۔

(۱۶۶) آیت ۶۰

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ ۝۶۰﴾

''اور بے شک اللہ لوگوں پر فضل کرنے والا ہے لیکن ان میں سے اکثر شکر نہیں کرتے''

اور سورۂ غافر (المؤمن) میں ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ۝۶۱﴾

''بے شک اللہ لوگوں پر فضل کرنے والا ہے لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔''

پہلی آیت میں ''اَكْثَرَهُمْ'' ضمیر کے ساتھ اور دوسری آیت میں ''اَكْثَرَ النَّاسِ'' لایا گیا ہے تو اس کی کیا وجہ ہے؟ ملاحظہ ہو کہ سورۂ غافر کی مذکورہ آیت سے قبل ارشاد ہوا:

﴿لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۵۷﴾

''بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش لوگوں کو پیدا کرنے سے بڑا کام ہے لیکن اکثر لوگ علم نہیں رکھتے۔''

اور اس آیت سے مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت کو بیان کیا جائے' کائنات کی نشانیوں کی طرف لوگ توجّہ دیں' اور چونکہ یہاں لوگوں کو نصیحت اور عبرت حاصل کرنے پر اُبھارا جا رہا ہے اس لیے ''النَّاسِ'' کا لفظ صراحت کے ساتھ دو دفعہ لایا گیا اور اسی مناسبت سے آیت ۶۰ میں بھی ''النَّاسِ'' کا لفظ دوبارہ لایا گیا' اس کی جگہ صرف ضمیر نہیں لائی گئی۔

اس کے مقابلے میں سورۂ یونس کی مذکورہ آیت سے قبل ایسی آیت لائی گئی جس میں اہل ایمان کے لیے اُمید کا سماں باندھا گیا ہے:

﴿قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ؕ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ۝۵۸﴾

''کہہ دیجیے کہ یہ (لوگ) خوش ہوں اللہ تعالیٰ کے فضل و انعام اور اُس کی رحمت پر' اور وہ اس سے بہتر ہے

کہ جو وہ (لوگ) جمع کر رہے ہیں۔''

اور پھر اس کے بعد اس کلام کا تسلسل ہے جو کفّار کے بارے میں بیان ہوا ہے' جیسے کہ ارشاد ہوا: ﴿قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّحَلٰلًا ؕ﴾ (آیت ۵۹) ''کہہ دیجیے' کیا دیکھا تم نے جو رزق اللہ نے تمہارے لیے اُتارا ہے اور تم نے اس میں سے کچھ کو حرام اور کچھ کو حلال بنا دیا۔'' اور پھر فرمایا:

﴿وَمَا ظَنُّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ﴾ (آیت ۶۰)

''اور کیا گمان ہے ان لوگوں کا جو قیامت کے دن اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں۔''

اور اس کے آخر میں مذکورہ آیت آ رہی ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ ۝۶۰﴾

یہاں چونکہ تکرارِ لفظ کی ضرورت نہ تھی جیسا کہ سورۂ غافر میں بیان کی گئی' اس لیے یہاں ''النَّاس'' کی تکرار نہیں کی گئی بلکہ اس کی جگہ ضمیر (یعنی اَكْثَرَهُمْ) لائی گئی جو کہ عام عربی اسلوب ہے' اور اس طرح دونوں آیتیں اپنی اپنی جگہ مناسبت رکھتی ہیں۔

(۱۶۷) آیت ۶۱

﴿وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ وَلَآ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرَ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝۶۱﴾

''اور تیرے رب سے کوئی چیز ذرہ برابر بھی غائب نہیں' نہ ہی زمین میں اور نہ ہی آسمان میں' نہ ہی ذرہ سے بھی چھوٹی چیز یا اس سے بڑی' سب کی سب ایک کتابِ مبین میں (درج) ہیں۔''

اور سورۂ سبا میں ارشاد فرمایا:

﴿عٰلِمِ الْغَيْبِ ۚ لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَلَآ اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرُ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝۳﴾

''وہ غیب کا علم رکھتا ہے' اس سے ذرہ برابر کوئی چیز پوشیدہ نہیں' نہ ہی آسمانوں میں اور نہ ہی زمین میں' اور نہ ہی اس سے چھوٹی یا اس سے بڑی کوئی بھی چیز' مگر یہ کہ وہ (سب کی سب) ایک کتابِ مبین میں (موجود) ہیں۔''

اور پھر اسی سورت میں ارشاد فرمایا:

﴿قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۚ لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّمَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيْرٍ ۝۲۲﴾

''کہہ دیجیے! کہ اللہ کے سوا جن جن کا تمہیں گمان ہے' ان سب کو پکار لو' وہ تو ذرہ برابر کسی چیز کا اختیار نہیں رکھتے' نہ ہی آسمانوں میں اور نہ ہی زمین میں' اور نہ ہی ان کا (ان اشیاء میں) کوئی حصّہ ہے اور نہ ہی ان میں سے کوئی ان کا مددگار ہے۔''

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سورۂ یونس میں پہلے زمین کا ذکر کیا گیا اور اس کے بعد آسمان کا' لیکن سورۂ سبا کی

دونوں آیات میں آسمان کا ذکر پہلے کیا گیا تو اس کی کیا وجہ ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ گو دونوں سورتوں میں عموم پایا جاتا ہے لیکن سورۂ یونس میں عموم کے ساتھ استیفاء (موضوع کا ہر طرح سے احاطہ کیا جانا) اور استغراق (موضوع کے ہر فرد کو شامل ہونا) دونوں مقصود ہیں۔

ملاحظہ ہو کہ سورۂ یونس کی مذکورہ آیت کا پہلا حصہ اپنے الفاظ کے اعتبار سے نہ صرف استغراق بلکہ قسم کا مفہوم بھی رکھتا ہے۔ فرمایا:

﴿وَمَا تَكُوْنُ فِيْ شَاْنٍ وَّمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ ؕ﴾

''اور آپ کسی بھی حال میں ہوں اور کہیں سے قرآن کی تلاوت کرتے ہوں اور آپ سب کوئی بھی کام کیوں نہ کرتے ہوں مگر ہم تم پر گواہ رہتے ہیں جب کہ تم اس میں مشغول ہوتے ہو۔''

خیال رہے کہ فاعل یا مفعول کے ساتھ ''مِنْ'' کا اضافہ استغراق کا معنی عطا کرتا ہے' اس بات کو نحو کے امام سیبویہ نے اس مثال سے سمجھایا ہے۔ اگر کوئی شخص کہے: مَا اَتَانِیْ رَجُلٌ (کوئی آدمی میرے پاس نہیں آیا) تو اس جملے کے تین معانی ہو سکتے ہیں:

(۱) تمہارے پاس ایک آدمی نہیں بلکہ ایک سے زائد آدمی آئے۔

(۲) تمہارے پاس کوئی مائی کا لال یعنی مرد نہیں آیا بلکہ کوئی کمزور شخص آیا۔

(۳) تمہارے پاس کوئی نہیں آیا' نہ ایک شخص نہ اس سے زیادہ۔

لیکن اگر آپ یوں کہیں: مَا اَتَانِیْ مِنْ رَجُلٍ (میرے پاس آدمیوں میں سے کوئی نہیں آیا) تو وہ تمام ترنفی ہوگی۔ یعنی کوئی بھی نہیں آیا۔ حاصل کلام یہ ہے کہ جملہ نافیہ ہو اور پھر اس میں ''مِنْ'' لایا جائے تو معنی عام ہو جاتا ہے جسے استغراق کہا جاتا ہے۔ اس آیت کے دونوں حصوں میں ''مِنْ'' کا اضافہ ہے' پہلے حصے میں مفعول کے ساتھ اور دوسرے حصے میں فاعل کے ساتھ ﴿وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ﴾۔ اب یہاں ذکر اس بات کا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے زمین و آسمان میں کوئی چیز مخفی نہیں ہے۔ اور یہاں زمین کا ذکر پہلے ہے اور وہ اس لیے کہ انسانوں کی نسبت سے زمین وہ جگہ ہے جہاں کی چیزیں ہم پر زیادہ پوشیدہ ہیں بہ نسبت آسمان کے۔

ہم آسمان کے بارے میں جانتے ہیں کہ وہاں سب امور طے ہوتے ہیں' وہ بلند و بالا ہے' فرشتوں کا مسکن ہے' ہمیشہ ہمارے مشاہدے میں رہتا ہے' دعا کرنے والے اسی کی جہت میں ہاتھ اٹھا کر دعا کرتے ہیں' وہیں سے احکام آتے ہیں' وہیں سے رزق نازل ہوتا ہے' وہیں سے کارندے فرشتے نازل ہوتے ہیں' اسی کی طرف اہلِ ایمان کی روحیں پرواز کرتی ہیں' فرشتے لوگوں کے اعمال سمیٹ کر واپس آسمان کی طرف عروج کرتے ہیں۔ ہم ایک دفعہ پھر یہ بات واضح کر دیں کہ یہاں اللہ کے علم کی نسبت سے زمین اور آسمان کا ذکر نہیں کیا جا رہا بلکہ ہمارے علم کی نسبت سے بات ہو رہی ہے' یعنی چونکہ ہمارا علم زمین کے بارے میں بہ نسبت آسمان زیادہ مخفی ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس

آیت میں زمین کا ذکر پہلے کیا اور آسمان کا بعد میں۔

اور جہاں تک اللہ تعالیٰ کے علم کا تعلق ہے تو اُس کا علم تو ہر چیز کو محیط ہے' اُس کے نزدیک تو ہمارا سری کلام ہو یا جہری سب برابر ہے۔ قرآن میں بندوں کے حالات کے مطابق کلام کیا گیا ہے۔ ہمارا تعجب کرنا' دعا کرنا' امید رکھنا وغیرہ ہمارے اپنے حالات کے عین مطابق ہے۔

اس آیت میں اس بات کی نفی کی گئی ہے کہ زمین و آسمان میں کوئی چیز اللہ سے پوشیدہ نہیں ہے' اور یہاں زمین کا ذکر ان اسباب کی بنا پر جو ہم بیان کر چکے ہیں پہلے کیا' اور پھر ''مِنْ'' لا کر اس میں عموم پیدا کیا گیا۔

اس سے ملتی جلتی آیت سورۂ ابراہیم کی ہے۔ فرمایا:

﴿رَبَّنَآ اِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِيْ وَمَا نُعْلِنُ ۭ وَمَا يَخْفٰى عَلَي اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاۗءِ ۝۳۸﴾

''اے ہمارے رب! بے شک تُو جانتا ہے جو ہم چھپاتے ہیں اور جو ہم ظاہر کرتے ہیں' اور اللہ پر کوئی چیز مخفی نہیں ہے' نہ ہی زمین میں اور نہ ہی آسمان میں۔''

یہ آیت بھی سورۂ یونس کی آیت کی طرح اللہ تعالیٰ کے علم کی وسعت بیان کر رہی ہے اور یہاں بھی زمین کا ذکر پہلے کیا گیا ہے جس کے حالات ہمارے نزدیک زیادہ پوشیدگی رکھتے ہیں۔

اور اگر کہا جائے کہ سورۃ النمل کی یہ آیت بھی ملاحظہ ہو:

﴿وَمَا مِنْ غَاۗىِٕبَةٍ فِي السَّمَاۗءِ وَالْاَرْضِ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝۷۵﴾

''اور کوئی ایسا غیب نہیں ہے' نہ ہی آسمان میں اور نہ ہی زمین میں مگر ایک کھلی کتاب میں ہے۔''

اس آیت میں بھی ''مَا'' نافیہ کے بعد ''مِنْ'' کا اضافہ ہے' یعنی اس آیت میں بھی عموم (اور استغراق) پایا جاتا ہے' لیکن یہاں آسمان کا ذکر پہلے ہے اور زمین کا بعد میں؟ اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ اس سے قبل کی آیت میں فرمایا:

﴿وَاِنَّ رَبَّكَ لَيَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۝۷۴﴾

''اور بے شک تیرا رب جانتا ہے جو ان کے سینے چھپاتے ہیں اور جو ظاہر کرتے ہیں۔''

یہاں یہ بات ملاحظہ ہو کہ سورۂ یونس اور سورۂ ابراہیم میں زمین کا ذکر پہلے کیا گیا جس کی حکمتیں ہم پہلے لکھ چکے ہیں اور اس کے بعد سورۃ النمل اور سورۂ سبا دونوں میں آسمان کا ذکر پہلے لایا گیا' گویا آسمان اور زمین دونوں کے ذکر میں ایک قسم کی مساوات پیدا کی گئی۔ دونوں جگہ عموم اور استغراق پایا جا رہا ہے' سورۂ یونس' سورۂ ابراہیم اور سورۃ النمل میں ''مِنْ'' کے اضافے کے ساتھ اور سورۂ سبا میں ''السَّمٰوٰت'' جمع کے صیغہ کے ساتھ لا کر اس عموم کو واضح کیا گیا۔

اضافہ از مترجم

مجھے مؤلف کی مذکورہ وضاحت میں تکلّف نظر آتا ہے' خاص طور پر اس بات میں کہ زمین کا علم انسان پر زیادہ

پوشیدہ ہے بہ نسبت آسمان کے‘ اور اس لیے دو سورتوں میں زمین کا ذکر پہلے کیا گیا۔ ابن عاشور کی مندرجہ ذیل وضاحت زیادہ قرین قیاس لگتی ہے‘ وہ کہتے ہیں کہ زمین اور آسمان سے مراد عالم سفلی اور عالم علوی ہے‘ مقصود نہایت اختصار کے ساتھ تمام اطراف کا احاطہ کرنا ہے۔ زمین کا ذکر پہلے کیا گیا (سورۂ یونس میں) اور وہ اس لیے کہ اس سے قبل لوگوں کے اعمال کا تذکرہ ہے کہ جن کا تعلق زمین سے ہے‘ بخلاف سورۂ سبا کے جہاں غیب کا ذکر ہے‘ اور غیب کا مطلب ہے وہ چیزیں جو لوگوں کی نظروں سے غائب ہوں‘ اور یہ زیادہ تر آسمان سے تعلق رکھتی ہیں‘ اس لیے وہاں آسمان کا ذکر پہلے لایا جانا مناسب تھا۔

---

(۱۶۸) آیت ۹۳

﴿وَلَقَدْ بَوَّاْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مُبَوَّاَ صِدْقٍ وَّرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۚ فَمَا اخْتَلَفُوْا حَتّٰى جَآءَهُمُ الْعِلْمُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝۹۳﴾

’’اور ہم نے بنی اسرائیل کے لیے ایک اچھا ٹھکانہ فراہم کیا اور انہیں پاکیزہ چیزیں کھانے کے لیے دیں‘ ان لوگوں نے اختلاف نہیں کیا مگر علم آجانے کے بعد۔ بے شک آپ کا ربّ قیامت کے دن ان کے درمیان فیصلہ کرے گا ان تمام چیزوں میں جن میں وہ اختلاف کیا کرتے تھے۔‘‘

اور سورۃ الجاثیہ میں ارشاد فرمایا:

﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلَي الْعٰلَمِيْنَ ۝۱۶ وَاٰتَيْنٰهُمْ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْاَمْرِ ۚ فَمَا اخْتَلَفُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۭ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝۱۷﴾

’’اور بے شک ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب‘ حکومت اور نبوت عطا کی‘ انہیں پاکیزہ رزق دیا‘ انہیں جہانوں پر فضیلت عطا کی‘ انہیں دین کی کھلی کھلی دلیلیں دیں‘ اور پھر انہوں نے اختلاف نہیں کیا مگر علم کے آجانے کے بعد اور وہ بھی سرکشی کی بنا پر۔ بے شک آپ کا ربّ قیامت کے دن ان کے مابین فیصلہ کرے گا ان تمام اُمور میں جن میں وہ اختلاف کیا کرتے تھے۔‘‘

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دونوں آیتوں کا مقصود ایک ہی ہے لیکن عبارت میں تھوڑا بہت اختلاف ہے اور خاص طور پر سورۃ الجاثیہ میں ’’مَا‘‘ (مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ) کا اضافہ ہے جو کہ سورۂ یونس کی آیت میں نہیں ہے تو اس کی کیا وجہ ہے؟

جواباً عرض ہے کہ دونوں سورتوں میں سیاق و سباق کے اعتبار سے اختصار اور طوالت کا اسلوب اپنایا گیا ہے‘ یعنی جہاں موضوع میں اختصار ہے وہاں الفاظ کے چناؤ میں بھی اختصار کا خیال رکھا گیا ہے اور جہاں تفصیل کے

ساتھ ایک بات کا بیان ہوا ہے تو وہاں الفاظ بھی زیادہ استعمال ہوئے ہیں۔

اب دیکھئے کہ سورۂ یونس کی مذکورہ آیت سے قبل فرعون کا قصہ مختصر انداز میں بیان ہوا ہے۔ ابتدا اس آیت سے ہوتی ہے:

﴿رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّاَمْوَالًا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا.....﴾ (آیت ۸۸)

''اے ہمارے رب! تُو نے فرعون اور اُس کے درباریوں کو اس دُنیوی زندگی میں مال اور زینت عطا کی ہے.....''

اور پھر ذکر ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے جو دعا مانگی تھی وہ پوری ہوئی' اللہ نے فرعون اور اس کے درباریوں کے مال فنا کر دیئے' انہیں پانی میں غرق کر دیا۔ بنی اسرائیل کو فرعونیوں سے نجات دی' ان کے دشمن کا قلع قمع کر دیا' اور بنی اسرائیل کو مال و دولت اور زمین کی وراثت سے نوازا' اور پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا جا رہا ہے کہ کیسے ان کو زمین میں ایک باوقار ٹھکانہ عطا کیا گیا۔ فرمایا: ﴿وَلَقَدْ بَوَّاْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مُبَوَّاَ صِدْقٍ﴾ یعنی وہ لوگ کمزور تھے' ظلم کا شکار ہو رہے تھے تو اللہ نے ان کے دشمن کو ان کی آنکھوں کے سامنے ہلاک کیا' انہیں امن و امان کی دولت سے مالا مال کیا' انہیں اپنی محیر العقول نشانیاں دکھائیں' ایسی نشانیاں کہ جن سے ایمان یقین میں بدل جاتا ہے لیکن پھر بھی انہوں نے اختلاف کیا۔ اور یہ وہ سُنّتِ الٰہی ہے جس کا تذکرہ اسی سورت کی آیت ۱۹ میں آ چکا ہے۔

﴿وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا ؕ﴾

''اور لوگ نہیں تھے مگر ایک ہی اُمّت اور پھر انہوں نے اختلاف کیا۔''

یہاں ان کا واقعہ اختصار کے ساتھ بیان ہوا ہے' اس لیے الفاظ میں بھی اختصار ہی سے کام لیا گیا۔

اب آیئے سورۃ الجاثیہ کی طرف۔ آیت مذکورہ سے قبل آسمان و زمین کی نشانیوں کا تذکرہ اس آیت سے شروع ہوتا ہے:

﴿اِنَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝۳﴾

''بے شک آسمانوں اور زمین میں اہلِ ایمان کے لیے نشانیاں ہیں۔''

پھر ذکر کیا انسان کو پیدا کرنے کا' زمین میں جانوروں کو بکھیرنے کا' رات دن کے آنے جانے کا' آسمان سے رزق کے اتارے جانے کا' ہواؤں کے تصرف کا' اور پھر یہ بتایا کہ ان نشانیوں کو صرف عقلاء ہی سمجھ سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کا اس طرح تفصیل سے ذکر یہاں ہے یا سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۶۴ میں' اور دونوں جگہ پھر کُفّار کی عقل کا ماتم کیا گیا ہے کہ وہ ان نشانیوں سے عبرت حاصل نہیں کرتے۔ سورۃ البقرۃ کی آیت کے بعد کُفّارِ عرب کے بارے میں کہا گیا:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ﴾ (آیت ۱۶۵)

''اور لوگوں میں سے کچھ ایسے ہیں جو اللہ کے سوا شریک ٹھہراتے ہیں' ان سے ایسی محبّت کرتے ہیں جیسے اللہ سے کی جاتی ہے۔''

یہاں کُفّار کی بدعقیدگی اور بداعمالی کی طرف اشارہ کیا جارہا ہے کہ کائنات کی ان عظیم اور واضح نشانیوں کو دیکھنے کے بعد بھی وہ عبرت حاصل نہیں کرتے۔ کیا وہ یہ نہیں دیکھتے کہ عقل بھی اس بات کو قبول نہیں کرتی کہ اتنی بڑی بڑی مخلوقات خود بخود وجود پذیر ہوجائیں۔ یہ ضروری ہے کہ ان کا کوئی خالق، کوئی صانع، کوئی موجد ہو جو بے پایاں قدرت کا حامل ہو، ورنہ اس سے قبل ایک اور موجد ماننا پڑے گا اور یہ سلسلہ کہیں جا کے نہیں رکے گا۔ اسے تسلسل کہا جاتا ہے جو کہ عقلاً محال ہے، اور پھر یہ کہنا کہ کائنات کے کئی اِلٰہ ہیں تو یہ بھی صحیح نہیں ہے۔ فرمایا:

﴿لَوْ كَانَ فِيهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا﴾ (الانبیاء:۲۲)

''اور اگر زمین و آسمان میں سوائے اللہ کے اور بھی الٰہ ہوتے تو دونوں کا نظام درہم برہم ہوجاتا۔''

نتیجۃً کہا جائے گا کہ خالق کائنات صرف ایک ذات ہے اور ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ﴾ (الشوریٰ:۱۱) یعنی اس کے مثل اور کوئی نہیں ہے۔ سورۃ الجاثیہ میں بھی آفاقی دلائل ذکر کرنے کے بعد کہا:

﴿تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۚ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۢ بَعْدَ اللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ۝۶﴾

''یہ اللہ کی آیات ہیں اور ہم انہیں حق کے ساتھ آپ پر تلاوت کر رہے ہیں۔ پھر یہ لوگ اللہ اور اُس کی آیات کے بعد کون سی بات پر ایمان لا رہے ہیں؟''

اور پھر چند آیات کے بعد جو بنی اسرائیل کا تذکرہ کیا گیا کہ کیسے انہوں نے کتاب، حکومت، نبوت، رزق کی کشائش اور تمام جہان پر فضیلت عطا کیے جانے کے بعد بھی اختلاف کیا تو پھر یہ بات واضح ہوگئی کہ کُفّارِ عرب سے پہلے بھی ایک ایسی قوم آچکی ہے جس کے سامنے تمام نشانیاں واضح طور پر آچکی تھیں، پھر انہیں اس امانت (اسلام) کا حامل بنایا گیا، انہیں حکومت، نبوت، نزولِ کتاب سب نعمتوں سے سرفراز کیا گیا، لیکن جب انہوں نے آپس میں اختلاف کیا، وحی اور ہدایت کو پس پشت ڈال دیا تو پھر وہ تمام اعزازات سے محروم کر دیے گئے، ان پر ذلت اور عاجزی طاری کر دی گئی، داؤد اور مسیح علیہما السلام نے ان پر لعنت بھیجی، سزا کے طور پر انہیں بندر اور سور بنایا گیا، اس لیے اہل عرب کو ان سے عبرت حاصل کرتے ہوئے بندگی اور اطاعت کا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔

سورۃ الجاثیہ میں بہ نسبت سورۂ یونس کے چونکہ اس موضوع کو تفصیل سے بیان کیا گیا تھا اس لیے یہاں طوالت سے کام لیا گیا۔ اور جیسا کہ ہم نے شروع میں کہا تھا، جہاں موضوع مختصر ہوگا وہاں الفاظ میں بھی اختصار ہوگا، اور جہاں تفصیل ہوگی وہاں الفاظ و معانی کا دربار بھی وسیع ہوتا جائے گا۔

(۱۶۹) آیت ۱۰۴

﴿وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۱۰۴﴾

''اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ مَیں مؤمنوں میں سے ہوجاؤں۔''

اور سورۃ النمل کے آخر میں ارشاد فرمایا:

﴿وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝۹۱﴾

''اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ مَیں مسلمانوں میں سے ہوجاؤں۔''

سوال یہ ہے کہ اس اختلاف کی کیا وجہ ہے؟ جواب جاننے کے لیے سورۂ یونس کی اس آیت سے ماقبل آیات کی تلاوت کیجیے جہاں متعدد بار ایمان ہی کا ذکر ہے۔ فرمایا:

﴿وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ۭ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝۹۹﴾

''اور اگر آپ کا رب چاہتا تو جو بھی زمین میں ہے سب کے سب ایمان لے آتے۔ تو کیا آپ لوگوں کو مجبور کر سکتے ہیں کہ وہ مؤمن بن جائیں!''

﴿وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ﴾ (آیت ۱۰۰)

''اور کوئی نفس ایمان نہیں لا سکتا مگر اللہ تعالیٰ کی مرضی سے۔''

﴿ثُمَّ نُنَجِّيْ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ ۚ حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۱۰۳﴾

''پھر ہم اپنے رسولوں اور ایمان والوں کو نجات دے دیتے ہیں' اور اسی طرح ہم پر یہ حق ہے کہ ہم مؤمنوں کو نجات دیں۔''

اور پھر اس کے بعد مذکورہ آیت ہے: ﴿وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۱۰۴﴾ تو یہاں اس آیت کا یہ لفظ مؤمنین لایا جانا بالکل مناسب تھا۔

یہاں ہم مزید وضاحت کرتے چلیں کہ بطورِ لغت ایمان کا مطلب ہے تصدیق کرنا۔ جیسے سورۂ یوسف میں ارشاد فرمایا: ﴿وَمَآ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا صٰدِقِيْنَ ۝۱۷﴾ ''اور آپ ہماری بات ماننے والے نہیں ہیں اگرچہ ہم سچے ہی کیوں نہ ہوں۔'' اور پھر کبھی اس کے معنی میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے تو تصدیق کے ساتھ اطاعت کا تصور بھی اس میں شامل ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ مذکورہ آیت میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

اور اس کے مقابلے میں اسلام کا مطلب ہے' جھک جانا اور تمام ظاہری اعمال کا بجالانا' لیکن اس میں بھی کبھی وسعت پیدا ہو جاتی ہے اور اطاعت کے ساتھ تصدیق اور اعتقاد کا مفہوم بھی داخل ہو جاتا ہے' اور یہی مفہوم ہے سورۃ النمل کی آیت کا: ﴿وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝۹۱﴾ یعنی ایمان اور اسلام ایک ہی معنی اور مفہوم رکھتے ہیں۔ اور پھر ایسے بھی مقامات ہیں جہاں ایمان اپنے محدود معنوں میں اور اسلام اپنے مفہوم میں مراد ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر سورۃ الحجرات کی یہ آیت ملاحظہ ہو:

﴿قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ۭ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا﴾ (آیت ۱۴)

''بدوؤں نے کہا کہ ہم ایمان لائے' کہہ دیجیے کہ تم ایمان نہیں لائے لیکن یہ کہو کہ ہم اسلام لائے ہیں۔''

اور اسی طرح حدیثِ جبریل میں ایمان بمعنی قلبی اعتقاد اور اسلام بمعنی اعمالِ ظاہرہ بیان کیا گیا ہے۔

اس تفصیل کے بعد یہ کہنا درست ہوگا کہ چونکہ سورۂ یونس میں بار بار ایمان کا تذکرہ تھا جو کہ ایک اعلیٰ مقام ہے تو اس کے بعد ''مُؤْمِنِيْنَ'' ہی کا لفظ لانا مناسب تھا' اور سورۃ النمل کی آیت سے قبل ارشاد ہوا تھا:

﴿اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ رَبَّ هٰذِهِ الْبَلْدَةِ الَّذِيْ حَرَّمَهَا وَلَهٗ كُلُّ شَيْءٍ﴾ (آیت ۹۱)

''بے شک مجھے اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ مَیں اس شہر (مکّہ) کے رب کی عبادت کروں جسے اللہ نے حرمت والا شہر قرار دیا ہے اور اُسی کے لیے ہر شے ہے۔''

اور یہ جو آخری لفظ ہے: ﴿وَلَهٗ كُلُّ شَيْءٍ﴾ تو اس میں مکمل اطاعت اور عاجزی کا اظہار ہے' اور ہر قسم کے شریک اور نظیر کی نفی ہے' اس لیے اس کے بعد مناسب تھا کہ مُسْلِمِيْنَ کا لفظ لایا جاتا اور کہا جاتا:

﴿وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝۹۱﴾

''اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ مَیں مسلمانوں میں سے ہو جاؤں۔''

اضافہ از مترجم

غالباً پہلے بھی تذکرہ کیا جا چکا ہے کہ اسلام اور ایمان کے بارے میں جاننے کے لیے یہ قاعدہ مفید رہا ہے: ''اِذَا اجْتَمَعَا تَفَرَّقَا وَاِذَا تَفَرَّقَا اجْتَمَعَا'' یعنی اگر یہ دونوں لفظ ایک ساتھ آئیں تو دونوں کا اپنا اپنا مفہوم ہو گا' یعنی ایمان سے اعتقادِ قلبی اور اسلام سے ظاہری اعمال مراد ہوں گے اور اگر دونوں علیحدہ علیحدہ آئیں تو ایمان کے ساتھ اسلام بھی مراد ہو گا' اور جہاں صرف اسلام آیا ہے وہاں ایمان بھی مراد ہو گا۔ جیسے سورۃ الحجرات کی مذکورہ آیت (قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا .....) میں ایمان اور اسلام دونوں وارد ہوئے ہیں اور اسی طرح حدیثِ جبریل میں بھی' تو وہاں ایمان اپنے معنی میں اور اسلام اپنے معنی میں لیا جائے گا۔ اور جہاں صرف ایمان کا تذکرہ ہے جیسے ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ تو اس میں قلبی اعتقاد اور ظاہری اعمال دونوں مراد ہوتے ہیں اور جہاں صرف اسلام کا تذکرہ ہے جیسے ﴿اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ﴾ (آل عمران:۱۹) ''اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے'' تو وہاں ظاہری اعمال کے ساتھ ساتھ قلبی اعتقاد بھی مقصود ہوتا ہے۔

---

(۱۷۰) آیت ۱۰۸

﴿فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ۝۱۰۸﴾

''تو جو ہدایت پا گیا تو وہ اپنے نفس کی خاطر ہدایت پر آیا' اور جو گمراہ ہوا تو اُس کا وبال اسی پر پڑے گا' اور مَیں تم پر نگہبان بنا کر نہیں بھیجا گیا ہوں۔''

اور سورۃ النمل میں ارشاد فرمایا:

﴿فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَقُلْ اِنَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ۝۹۲﴾

''تو جو کوئی ہدایت پا گیا وہ اپنے ہی بھلے کے لیے ہدایت پا گیا' اور جو گمراہ ہوا تو کہہ دیجیے کہ مَیں تو صرف خبردار کرنے والوں میں سے ہوں۔''

سوال یہ ہے کہ دونوں آیات کی ابتدا تو ایک جیسی ہے لیکن اختتامیہ کلمات کیوں مختلف ہیں؟ تو اس کا جواب یہ

ہے کہ سورۂ یونس کی آیت سے ماقبل یہ آیت بیان ہو چکی ہے:

﴿وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ۭ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝۹۹﴾

''اور اگر آپ کا رب چاہتا تو جو بھی روئے زمین پر ہیں وہ سب کے سب ایمان لے آتے۔ تو کیا آپ لوگوں کو مجبور کر سکتے ہیں کہ وہ ایمان لے آئیں!''

اور یہی معنی سورۃ الزمر میں بھی لیے گئے ہیں:

﴿اِنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ۝۴۱﴾

''ہم نے آپ پر لوگوں کے لیے یہ کتاب حق کے ساتھ نازل کی ہے۔ تو جو شخص راہِ راست پر آ گیا تو اس کا بھلا اسی کے لیے ہے' اور جو شخص بھٹک گیا تو اس کا وبال بھی اُسی پر ہے' اور آپ ان پر نگہبان بنا کر نہیں بھیجے گئے۔''

اور یہی آخری الفاظ ﴿وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ۝۱۰۸﴾ سورۂ یونس کے تناظر میں بالکل مناسب ہیں۔ اور جہاں تک سورۃ النمل کا تعلق ہے تو وہاں اس سے قبل یہ آیات وارد ہیں:

﴿فَتَوَكَّلْ عَلَي اللّٰهِ ۭ اِنَّكَ عَلَي الْحَقِّ الْمُبِيْنِ ۝۷۹ اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَاۗءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ ۝۸۰ وَمَآ اَنْتَ بِهٰدِ الْعُمْيِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ ۭ اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝۸۱﴾

''تو پھر آپ اللہ پر بھروسہ کریں' بے شک آپ کھلے کھلے حق پر ہیں۔ بے شک آپ نہ مُردوں کو سنا سکتے ہیں اور نہ بہروں کو پکار سکتے ہیں جب کہ وہ پیٹھ پھیر کر جا رہے ہوں۔ اور نہ آپ اندھوں کو گمراہی کے راستے سے (ہٹا کر) ہدایت دے سکتے ہیں۔ آپ انہی کو سنا سکتے ہیں جو ہماری آیات پر ایمان لاتے ہیں اور پھر اطاعت گزار ہو جاتے ہیں۔''

ان آیات کے تناظر میں نبی ﷺ کی زبان سے یہ کہا جانا کہ ﴿وَمَنْ ضَلَّ فَقُلْ اِنَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ۝۹۲﴾ ہی مناسب تھا۔ یعنی ہر دو آیات کا اختتام اپنی اپنی جگہ بالکل مناسب تھا۔ ❁❁❁

جہاد فی سبیل اللہ

اصل حقیقت' اہمیت ولزوم اور مراحل و مدارج

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کا ایک جامع خطاب

ترجمۂ قرآن مجید

مع صرفی ونحوی تشریح

افادات: حافظ احمد یار مرحوم

ترتیب وتدوین: لطف الرحمٰن خان مرحوم

سورۂ ھُود

آیات ۸۴ تا ۹۵

﴿وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ
وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ اِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ بِخَيْرٍ وَّاِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ
مُّحِيْطٍ ﴿۸۴﴾ وَيٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ
اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۸۵﴾ بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ
مُّؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ﴿۸۶﴾ قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا
يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ؕ اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ ﴿۸۷﴾ قَالَ
يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَرَزَقَنِيْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا ؕ وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ
اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَآ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ ؕ اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ؕ وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ
اِلَّا بِاللّٰهِ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ ﴿۸۸﴾ وَيٰقَوْمِ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِيْٓ اَنْ يُّصِيْبَكُمْ
مِّثْلُ مَآ اَصَابَ قَوْمَ نُوْحٍ اَوْ قَوْمَ هُوْدٍ اَوْ قَوْمَ صٰلِحٍ ؕ وَمَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ
بِبَعِيْدٍ ﴿۸۹﴾ وَاسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ؕ اِنَّ رَبِّيْ رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ ﴿۹۰﴾ قَالُوْا
يٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ وَاِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْنَا ضَعِيْفًا ۚ وَلَوْلَا رَهْطُكَ
لَرَجَمْنٰكَ ۖ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْنَا بِعَزِيْزٍ ﴿۹۱﴾ قَالَ يٰقَوْمِ اَرَهْطِيْٓ اَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ ؕ
وَاتَّخَذْتُمُوْهُ وَرَآءَكُمْ ظِهْرِيًّا ؕ اِنَّ رَبِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿۹۲﴾ وَيٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى

مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ ؕ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ ؕ وَارْتَقِبُوْٓا اِنِّيْ مَعَكُمْ رَقِيْبٌ ﴿۹۳﴾ وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَاَخَذَتِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿۹۴﴾ كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ؕ اَلَا بُعْدًا لِّمَدْيَنَ كَمَا بَعِدَتْ ثَمُوْدُ ﴿۹۵﴾

رھط

رَھَطَ یَرْھَطُ (ف) رَھْطًا: بڑا لقمہ لینا' بہت کھانا۔

اِرْتَھَطَ (افتعال) اِرْتِھَاطًا: قوم کا جمع ہونا' اکٹھا ہونا۔

رَھْطٌ: افراد کا گروہ' جتھہ' برادری۔ زیر مطالعہ آیت ۹۱

ترکیب

(آیت ۸۶) بَقِیَّتُ دراصل بَقِیَّةٌ ہے۔ اس آیت میں اس کو لمبی تا (ت) سے لکھنا قرآن مجید کی مخصوص اِملا ہے۔ یہاں کے علاوہ یہ لفظ قرآن مجید میں دو جگہ (البقرۃ:۲۴۸' ھود:۱۱۶) آیا ہے اور وہاں دونوں جگہ اسے گول تا (ۃ) سے بَقِیَّةٌ لکھا جاتا ہے۔ (آیت ۸۷) اَنْ نَّفْعَلَ سے پہلے اَنْ نَّتْرُكَ محذوف ہے' اس آیت میں نَشٰٓؤُا بھی قرآن حکیم کی مخصوص اِملا ہے۔ (آیت ۹۱) نَفْقَهُ کے آخر میں مادہ (فقہ) کی ھَا ہے' اس لیے اس پر سیدھا پیش آیا ہے۔ یہ اگر ضمیر ہوتی تو اس پر اُلٹا پیش آتا۔

ترجمہ:

وَاِلٰى مَدْيَنَ: اور (بے شک ہم بھیج چکے ہیں) مدین کی طرف

قَالَ يٰقَوْمِ: انہوں نے کہا: اے میری قوم!

مَا لَكُمْ: نہیں ہے تمہارے لیے

وَلَا تَنْقُصُوا: اور تم لوگ کمی مت کرو

اِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ: بے شک میں دیکھتا ہوں تم لوگوں کو

وَّاِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ: اور بے شک میں ڈرتا ہوں تم پر

وَيٰقَوْمِ: اور اے میری قوم

الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ: پیمانے کو اور ترازو کو

وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ: اور حق سے کم مت دو لوگوں کو

وَلَا تَعْثَوْا: اور انتشار مت پھیلاؤ

اَخَاهُمْ شُعَيْبًا: اُن کے بھائی شعیبؑ کو

اعْبُدُوا اللّٰهَ: تم بندگی کرو اللہ کی

مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ: کوئی بھی الٰہ اُس کے علاوہ

الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ: پیمانے اور ترازو میں

بِخَيْرٍ: (معاشی) بھلائی میں

عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيْطٍ: ایک گھیرنے والے دن کے عذاب سے

اَوْفُوا: تم پورا بھرو

بِالْقِسْطِ: انصاف سے

اَشْيَآءَهُمْ: اُن کی چیزیں

فِي الْاَرْضِ: زمین میں

مُفْسِدِيْنَ: نظم بگاڑنے والے ہوتے ہوئے

خَيْرٌ لَّكُمْ: بہتر ہیں تمہارے لیے

مُّؤْمِنِيْنَ: ایمان لانے والے

عَلَيْكُمْ: تم پر

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ: ان لوگوں نے کہا: اے شعیب

تَاْمُرُكَ: حکم دیتی ہے آپ کو

مَا يَعْبُدُ: اُن کو جن کی بندگی کرتے ہیں

اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ: یا (ہم چھوڑ دیں) کہ ہم کریں

مَا نَشٰٓؤُا: وہ جو ہم چاہیں

الْحَلِيْمُ: بڑے بردبار ہیں

قَالَ يٰقَوْمِ: انہوںؑ نے کہا: اے میری قوم

اِنْ كُنْتُ: اگر میں ہوں

مِّنْ رَّبِّيْ: اپنے ربّ (کی طرف) سے

مِنْهُ: اپنے پاس سے

وَمَآ اُرِيْدُ: اور میں ارادہ نہیں رکھتا

اِلٰى مَآ: اُس کی طرف

اِنْ اُرِيْدُ: میں ارادہ نہیں رکھتا

مَا اسْتَطَعْتُ: اتنی جتنی میری استطاعت ہے

اِلَّا بِاللّٰهِ: مگر اللہ سے

وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ: اور اُس کی طرف ہی میں رُخ کرتا ہوں

لَا يَجْرِمَنَّكُمْ: ہرگز آمادہ نہ کرے تم کو

اَنْ يُّصِيْبَكُمْ: کہ آ لگے تم کو

قَوْمَ نُوْحٍ: نوحؑ کی قوم کو

اَوْ قَوْمَ صٰلِحٍ: یا صالحؑ کی قوم کو

مِّنْكُمْ بِبَعِيْدٍ: تم سے کچھ دُور

بَقِيَّتُ اللّٰهِ: اللہ کی چھوڑی ہوئی چیزیں (جو حرام نہیں ہوئیں)

اِنْ كُنْتُمْ: اگر تم لوگ ہو

وَمَآ اَنَا: اور میں نہیں ہوں

بِحَفِيْظٍ: نگہبان

اَصَلٰوتُكَ: کیا آپ کی نماز

اَنْ نَّتْرُكَ: کہ ہم چھوڑ دیں

اٰبَآؤُنَآ: ہمارے آباء واَجداد

فِيْٓ اَمْوَالِنَا: اپنے مالوں میں

اِنَّكَ لَاَنْتَ: بے شک آپ ہی یقیناً

الرَّشِيْدُ: بڑے نیک چلن ہیں!

اَرَءَيْتُمْ: کیا تم نے غور کیا

عَلٰى بَيِّنَةٍ: ایک واضح (دلیل) پر

وَرَزَقَنِيْ: اور اُس نے عطا کیا مجھ کو

رِزْقًا حَسَنًا: ایک رزقِ حسن

اَنْ اُخَالِفَكُمْ: کہ تمہاری مخالفت کروں

اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ: میں منع کرتا ہوں تم کو جس سے

اِلَّا الْاِصْلَاحَ: مگر اصلاح کا

وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ: اور نہیں ہے میری توفیق

عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ: اُس پر ہی میں نے بھروسہ کیا

وَيٰقَوْمِ: اور اے میری قوم

شِقَاقِيْٓ: میری مخالفت کرنا

مِّثْلُ مَآ اَصَابَ: اُس کے جیسا جو آ لگا

اَوْ قَوْمَ هُوْدٍ: یا ھودؑ کی قوم کو

وَمَا قَوْمُ لُوْطٍ: اور نہیں ہے لوطؑ کی قوم

وَاسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ: اور تم لوگ مغفرت مانگو اپنے رب سے

ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ: پھر تم پلٹو اُس کی طرف

رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ: ہر حال میں رحم کرنے والا ہے، بے انتہا محبت کرنے والا ہے

مَا نَفْقَهُ: ہم پوری طرح نہیں سمجھ پاتے

مِّمَّا تَقُوْلُ: اس میں سے جو آپ کہتے ہیں

فِيْنَا ضَعِيْفًا: ہم میں کمزور

لَرَجَمْنٰكَ: تو ہم ضرور رجم کرتے آپ کو

عَلَيْنَا بِعَزِيْزٍ: ہم پر کوئی بالادست

اَرَهْطِيْٓ: کیا میرا قبیلہ

مِّنَ اللّٰهِ: اللہ سے

وَرَآءَكُمْ: اپنے پیچھے

اِنَّ رَبِّيْ: بے شک میرا رب

مُحِيْطٌ: احاطہ کرنے والا ہے

عَلٰى مَكَانَتِكُمْ: اپنی جگہ پر

سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ: عنقریب تم جان لوگے

عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ: ایک ایسا عذاب جو رسوا کرے گا اس کو

وَارْتَقِبُوْٓا: اور تم لوگ انتظار کرو

رَقِيْبٌ: انتظار کرنے والا ہوں

اَمْرُنَا: ہمارا حکم

وَالَّذِيْنَ: اور اُن لوگوں کو جو

بِرَحْمَةٍ مِّنَّا: رحمت سے ہماری (طرف سے)

الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا: ان کو جنہوں نے ظلم کیا

فَاَصْبَحُوْا: تو وہ ہو گئے

جٰثِمِيْنَ: اوندھے گرنے والے

اِنَّ رَبِّيْ: بے شک میرا رب

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ: ان لوگوں نے کہا: اے شعیب!

كَثِيْرًا: اکثر کو

وَاِنَّا لَنَرٰىكَ: اور بے شک ہم دیکھتے ہیں آپ کو

وَلَوْلَا رَهْطُكَ: اور اگر نہ ہوتا آپ کا قبیلہ

وَمَآ اَنْتَ: اور آپ نہیں ہیں

قَالَ يٰقَوْمِ: انہوں نے کہا: اے میری قوم!

اَعَزُّ عَلَيْكُمْ: زیادہ سخت ہے تم لوگوں پر

وَاتَّخَذْتُمُوْهُ: اور تم نے بنایا اس کو (یعنی اللہ کو)

ظِهْرِيًّا: پیٹھ پیچھے ڈالا ہوا (یعنی بھلایا ہوا)

بِمَا تَعْمَلُوْنَ: اس کا جو تم لوگ کرتے ہو

وَيٰقَوْمِ اعْمَلُوْا: اور اے میری قوم تم لوگ عمل کرو

اِنِّيْ عَامِلٌ: بے شک میں (بھی) عمل کرنے والا ہوں

مَنْ يَّاْتِيْهِ: کون ہے پہنچے گا جس کو

وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ: اور کون ہے وہ جو جھوٹ کہنے والا ہے

اِنِّيْ مَعَكُمْ: بے شک میں (بھی) تمہارے ساتھ

وَلَمَّا جَآءَ: اور جب آیا

نَجَّيْنَا شُعَيْبًا: تو ہم نے نجات دی شعیبؑ کو

اٰمَنُوْا مَعَهٗ: ایمان لائے ان کے ساتھ

وَاَخَذَتِ: اور پکڑا

الصَّيْحَةُ: چنگھاڑ نے

فِيْ دِيَارِهِمْ: اپنے گھروں میں

كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا: جیسے کہ وہ رہتے ہی نہ تھے اس میں

اَلَا بُعْدًا: سُن لو دُوری ہے　　لِّمَدْیَنَ: مدین (والوں) کے لیے

كَمَا بَعِدَتْ ثَمُوْدُ: جیسے دُور ہوئے ثمود

نوٹ ۱: آیت ۸۷ میں اسلام کے مقابلہ میں جاہلیت کے نظریہ کی پوری ترجمانی ہے۔ اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ اللہ کی بندگی کے سوا جو طریقہ بھی ہے وہ غلط ہے' کیونکہ دوسرے طریقے کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے۔ اور یہ کہ اللہ کی بندگی صرف محدود مذہبی دائرے ہی میں نہیں ہونی چاہیے' بلکہ زندگی کے تمام شعبوں میں ہونی چاہیے۔ اس لیے کہ دنیا میں انسان کے پاس جو کچھ بھی ہے' اللہ ہی کا ہے اور انسان کسی چیز پر بھی اللہ کی مرضی سے آزاد ہو کر تصرف کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ اس کے مقابلہ میں جاہلیت کا نظریہ یہ ہے کہ باپ دادا سے جو طریقہ چلا آ رہا ہے اُس کی پیروی کے لیے اس دلیل کے سوا کسی مزید دلیل کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ باپ دادا کا طریقہ ہے۔ نیز یہ کہ دین و مذہب کا تعلق صرف پوجا پاٹ سے ہے' رہے دُنیوی معاملات تو ان میں ہم کو پوری آزادی ہونی چاہیے کہ ہم جس طرح چاہیں کام کریں۔

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ زندگی کو مذہبی اور دنیوی دائروں میں تقسیم کرنے کا تخیل (یعنی Secularism) آج کا کوئی نیا تخیل نہیں ہے بلکہ آج سے تین' ساڑھے تین ہزار سال پہلے حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کو بھی اس تقسیم پر ویسا ہی اصرار تھا جیسا آج اہلِ مغرب اور ان کے مشرقی شاگردوں کو ہے۔ یہ فی الحقیقت کوئی نئی روشنی نہیں ہے جو انسان کو آج ذہنی ارتقاء کی بدولت نصیب ہو گئی ہے' بلکہ یہ وہی پرانی تاریک خیالی ہے جو ہزارہا برس پہلے کی جاہلیت میں پائی جاتی تھیں اور اس کے خلاف اسلام کی کشمکش بھی آج کی نہیں ہے بلکہ بہت قدیم ہے۔ (تفہیم القرآن)

نوٹ ۲: آیت ۸۸ میں رزقِ حسن سے مراد علم وحی ہے۔ جس طرح مادی رزق انسان کی مادی زندگی کے باقی رہنے کے لیے ضروری ہے اسی طرح وحی الٰہی کا رزقِ حسن انسان کی روحانی زندگی کے لیے ضروری ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قول ہے کہ انسان صرف روٹی سے نہیں جیتا بلکہ اُس کلمہ سے جیتا ہے جو اللہ کی طرف سے آتا ہے۔ (تدبّرِ قرآن)

نوٹ ۳: ممکن ہے حضرت شعیب علیہ السلام اپنی معاش کے لیے خود بھی تجارت کرتے ہوں۔ اس چیز سے شریروں نے فائدہ اٹھا کر یہ شوشہ چھوڑا ہو کہ یہ ناپ تول میں ایمانداری کا وعظ اس لیے کرتے ہیں کہ ہم تو ایمانداری کے ہو کر رہ جائیں اور یہ اپنی من مانی کر کے پورے بازار پر قبضہ کر لیں۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے ان کی یہ بدگمانی دور کرنے کے لیے فرمایا: ﴿وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَآ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ﴾ یعنی بعد میں خود میں وہ کام کروں جس سے تم کو منع کرتا ہوں۔ اصلاح کرنے کے علاوہ میرا اور کوئی ارادہ نہیں ہے۔ (تدبّرِ قرآن)

آیات ۹۶ تا ۱۰۴

﴿وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۹۶﴾ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَاتَّبَعُوْۤا اَمْرَ فِرْعَوْنَ ۚ وَمَآ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيْدٍ ﴿۹۷﴾ يَقْدُمُ قَوْمَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ ؕ

وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ ﴿۹۸﴾ وَاُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهٖ لَعْنَةً وَّيَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ ﴿۹۹﴾ ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ مِنْهَا قَآئِمٌ وَّحَصِيْدٌ ﴿۱۰۰﴾ وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَمَآ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِيْ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ لَّمَّا جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ؕ وَمَا زَادُوْهُمْ غَيْرَ تَتْبِيْبٍ ﴿۱۰۱﴾ وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِيَ ظَالِمَةٌ ؕ اِنَّ اَخْذَهٗٓ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ ﴿۱۰۲﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْاٰخِرَةِ ؕ ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ ۙ لَّهُ النَّاسُ وَذٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ ﴿۱۰۳﴾ وَمَا نُؤَخِّرُهٗٓ اِلَّا لِاَجَلٍ مَّعْدُوْدٍ ﴿۱۰۴﴾

ورد

وَرَدَ يَرِدُ (ض) وُرُوْدًا: پانی تک پہنچنا یا آنا۔ پھر کسی بھی جگہ تک پہنچنے کے لیے آتا ہے (جَاءَ اور اَتٰی کی طرح اس کا بھی مفعول آتا ہے۔ دیکھیں البقرۃ: ۲۳، نوٹ ۲) ﴿وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْيَنَ﴾ (القصص: ۲۳) ''اور جب وہ پہنچے مدین کے پانی (یعنی کنویں) تک۔''

وَارِدٌ (اسم الفاعل): (۱) پہنچنے والا۔ (۲) سقّہ، بہشتی۔ ﴿وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا﴾ (مریم: ۷۱) ''اور نہیں ہے کوئی تم میں سے مگر یہ کہ پہنچنے والا ہے اُس تک''۔ ﴿وَجَآءَتْ سَيَّارَةٌ فَاَرْسَلُوْا وَارِدَهُمْ﴾ (یوسف: ۱۹) ''اور آیا ایک قافلہ تو انہوں نے بھیجا اپنے سقّہ کو۔''

مَوْرُوْدٌ (اسم المفعول): جس تک پہنچا جائے۔ زیر مطالعہ آیت ۹۸۔

وَرِيْدٌ: خون پہنچنے کا راستہ۔ گردن کی ایک رگ جس سے سارے بدن کو خون پہنچتا ہے' اسے ''حَبْلُ الْوَرِيْدُ'' (شہ رگ) کہتے ہیں۔ جانور کو ذبح کرتے وقت یہی رگ کاٹ دیتے ہیں تو سارے بدن کا خون نکل جاتا ہے۔ ﴿وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ﴿۱۶﴾﴾ (ق) ''اور ہم اس کے (یعنی انسان کے) زیادہ قریب ہیں بہ نسبت شہ رگ کے۔''

وِرْدٌ: (۱) پانی تک پہنچنے کی جگہ' گھاٹ۔ زیر مطالعہ آیت ۹۸۔ (۲) پیاسا (پیاسے انسان اور جانور ہی گھاٹ پر آتے ہیں)۔ ﴿وَنَسُوْقُ الْمُجْرِمِيْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ وِرْدًا ﴿۸۶﴾﴾ (مریم) ''اور ہم ہانکیں گے مجرموں کو جہنّم کی طرف پیاسے ہوتے ہوئے۔''

وَرُدَ يَرُدُ (ک) وُرُوْدَةً: کسی چیز کا زردی مائل سرخ ہونا' گلابی ہونا۔

وَرْدٌ: گلاب کا پھول۔ یہ لفظ قرآن مجید میں استعمال نہیں ہوا۔

وَرْدَةٌ: گلابی رنگت۔ ﴿فَاِذَا انْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ ﴿۳۷﴾﴾ (الرحمٰن) ''پھر جب پھٹے گا آسمان تو وہ ہو جائے گا گلابی جیسے تیل کی چکناہٹ۔''

اَوْرَدَ (افعال) اِيْرَادًا: کسی کو کسی جگہ پہنچانا۔ زیر مطالعہ آیت ۹۸۔

ر ف د

رَفَدَ یَرْفِدُ (ض) رَفْدًا: بخشش دینا' عطیہ دینا۔

رِفْدٌ: وہ چیز جس میں رکھ کر بخشش دی جائے۔ زیر مطالعہ آیت ۹۹۔

مَرْفُوْدٌ (اسم المفعول): بخشش میں دی ہوئی چیز۔ زیر مطالعہ آیت ۹۹۔

ت ب ب

تَبَّ یَتُبُّ (ن) تَبًّا: تباہ و برباد ہونا' ہلاکت میں پڑنا (فعل لازم)۔ تباہ و برباد کرنا' ہلاکت میں ڈالنا (فعل متعدی) ﴿تَبَّتْ یَدَآ اَبِیْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ①﴾ (اللھب) ''تباہ ہوں ابولہب کے دونوں ہاتھ اور وہ (خود بھی) تباہ ہو۔''

تَبَابٌ: تباہی' ہلاکت۔ ﴿وَمَا كَیْدُ فِرْعَوْنَ اِلَّا فِیْ تَبَابٍ ㉗﴾ (المؤمن) ''اور نہیں تھی فرعون کی تدبیر مگر ہلاکت میں۔''

تَبَّبَ (تفعیل) تَتْبِیْبًا: انتہائی تباہی اور ہلاکت میں ڈالنا۔ زیر مطالعہ آیت ۱۰۱۔

ترجمہ:

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا: اور بے شک ہم بھیج چکے ہیں	مُوْسٰی بِاٰیٰتِنَا: موسیٰ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ
وَسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ: اور قطعی دلیل کے ساتھ	اِلٰی فِرْعَوْنَ: فرعون کی طرف
وَمَلَا۟ئِهٖ: اور اُس کے سرداروں کی طرف	فَاتَّبَعُوْۤا: پھر (بھی) ان لوگوں نے پیروی کی
اَمْرَ فِرْعَوْنَ: فرعون کے حکم کی	وَمَاۤ اَمْرُ فِرْعَوْنَ: اور نہیں تھا فرعون کا حکم
بِرَشِیْدٍ: کوئی سوجھ بوجھ والا	یَقْدُمُ قَوْمَهٗ: وہ آگے ہوگا اپنی قوم کے
یَوْمَ الْقِیٰمَةِ: قیامت کے دن	فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ: پھر وہ پہنچائے گا اُن کو آگ تک
وَبِئْسَ: اور کتنا بُرا ہے	الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ: پہنچے جانے والا گھاٹ
وَاُتْبِعُوْا: اور پیچھے لگائی گئی (ان کے)	فِیْ هٰذِهٖ لَعْنَةً: اس (دنیا) میں ایک لعنت
وَیَوْمَ الْقِیٰمَةِ: اور قیامت کے دن (بھی)	بِئْسَ: کتنی بُری ہے
الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ: بخشش دیے جانے والی جگہ	ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰی: یہ بستیوں کی خبروں میں سے (ایک خبر) ہے
نَقُصُّهٗ عَلَیْكَ: ہم بیان کرتے ہیں جس کو آپؐ پر	مِنْهَا قَآىِٕمٌ: ان (بستیوں) میں سے کچھ قائم ہیں
وَّحَصِیْدٌ: اور کچھ تہس نہس کی ہوئی ہیں	وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ: اور ہم نے ظلم نہیں کیا ان پر
وَلٰكِنْ: اور لیکن (یعنی بلکہ)	ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ: انہوں نے ظلم کیا اپنی جانوں پر

فَمَآ اَغْنَتْ عَنْهُمْ : تو کام نہ آئے ان کے

يَدْعُوْنَ : وہ پکارتے تھے

مِنْ شَيْءٍ : کچھ بھی

اَمْرُ رَبِّكَ : آپ کے رب کا حکم

غَيْرَ تَتْبِيْبٍ : انتہائی ہلاکت میں ڈالنے کے سوا

اَخْذُ رَبِّكَ : آپ کے رب کی پکڑ ہے

وَهِيَ : اس حال میں کہ وہ

اِنَّ اَخْذَهٗٓ : بے شک اُس کی پکڑ

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ : بے شک اس میں

لِّمَنْ خَافَ : اس کے لیے جس نے خوف کیا

ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ : یہ جمع کیے جانے والا ایک دن ہے

وَذٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ : اور یہ معائنہ کیے جانے والا ایک دن ہے

اِلَّا لِاَجَلٍ مَّعْدُوْدٍ : مگر ایک گنی ہوئی مدت کے لیے

اٰلِهَتُهُمُ الَّتِيْ : ان کے وہ الٰہ جن کو

مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ : اللہ کے علاوہ

لَمَّا جَآءَ : جب آیا

وَمَا زَادُوْهُمْ : اور ان (خداؤں) نے نہیں زیادہ کیا ان کو

وَكَذٰلِكَ : اور اس طرح

اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى : جب بھی وہ پکڑتا ہے بستیوں کو

ظَالِمَةٌ : ظلم کرنے والی ہوں

اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ : شدید دردناک ہے

لَاٰيَةً : یقیناً ایک نشانی ہے

عَذَابَ الْاٰخِرَةِ : آخرت کے عذاب کا

لَّهُ النَّاسُ : اُس کے (یعنی اللہ کے) لیے لوگوں کو

وَمَا نُؤَخِّرُهٗٓ : اور ہم مؤخر نہیں کرتے اس کو

آیات ۱۰۵ تا ۱۱۱

يَوْمَ يَاْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَّسَعِيْدٌ ﴿۱۰۵﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ شَقُوْا فَفِي
النَّارِ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّشَهِيْقٌ ﴿۱۰۶﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا
مَا شَآءَ رَبُّكَ ۭ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ﴿۱۰۷﴾ وَاَمَّا الَّذِيْنَ سُعِدُوْا فَفِي الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ
فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ۭ عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ ﴿۱۰۸﴾ فَلَا تَكُ
فِيْ مِرْيَةٍ مِّمَّا يَعْبُدُ هٰٓؤُلَآءِ ۭ مَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا كَمَا يَعْبُدُ اٰبَاۗؤُهُمْ مِّنْ قَبْلُ ۭ وَاِنَّا
لَمُوَفُّوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ غَيْرَ مَنْقُوْصٍ ﴿۱۰۹﴾ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ۭ
وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۭ وَاِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ﴿۱۱۰﴾ وَاِنَّ
كُلًّا لَّمَّا لَيُوَفِّيَنَّهُمْ رَبُّكَ اَعْمَالَهُمْ ۭ اِنَّهٗ بِمَا يَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۱۱۱﴾

ش ق و

شَقَا یَشْقُوْا (س) شَقًا: (۱) کسی مشقت یا سختی میں پڑنا (۲) نامراد یا بدبخت ہونا۔ زیر مطالعہ آیت ۱۰۶۔

شَقِیٌّ (فَعِیْلٌ کے وزن پر صفت): نامراد، بدبخت۔ زیر مطالعہ آیت ۱۰۵۔

اَشْقٰی (افعل التفضیل): زیادہ یا سب سے زیادہ بدبخت۔ ﴿وَیَتَجَنَّبُهَا الْاَشْقَى ⑪ الَّذِیْ یَصْلَى النَّارَ الْكُبْرٰى ⑫﴾ (الاعلیٰ) ''اور اُس سے (یعنی نصیحت سے) اجتناب کرے گا وہ بڑا بدبخت، جو داخل ہوگا بڑی آگ میں۔''

شِقْوَةٌ (اسم ذات): نامرادی، بدبختی۔ ﴿قَالُوْا رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَیْنَا شِقْوَتُنَا﴾ (المؤمنون: ۱۰۶) ''انہوں نے کہا: اے ہمارے ربّ! غالب ہوئی ہم پر ہماری بدبختی۔''

س ع د

سَعِدَ یَسْعَدُ (س) سَعَادَةً: سَعِدَ اور سُعِدَ دونوں کے معنی ہیں: نیک بخت ہونا۔ زیر مطالعہ آیت ۱۰۸۔

سَعِیْدٌ: نیک بخت۔ زیر مطالعہ آیت ۱۰۵۔

ز ف ر

زَفَرَ یَزْفِرُ (ض) زَفْرًا: روتے وقت سانس باہر نکالنا، آہ بھرنا، چیخنا۔

زَفِیْرٌ: آہیں بھرنے والا، چیخنے والا۔ زیر مطالعہ آیت ۱۰۶۔

ش ھ ق

شَهَقَ یَشْهَقُ (ف) و شَهِقَ یَشْهَقُ (س) تَشْهَاقًا: روتے وقت سانس اندر کھینچنا، سسکی لینا، رینکنا۔

شَهِیْقٌ: سسکی لینے والا، رینکنے والا۔ زیر مطالعہ آیت ۱۰۶۔

ج ذ ذ

جَذَّ یَجُذُّ (ن) جَذًّا: کسی چیز کو توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دینا، کاٹنا۔

جُذَاذٌ: ٹکڑے۔ ﴿فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا﴾ (الانبیاء: ۵۸) ''پھر انہوں نے کر دیا ان کو ٹکڑے ٹکڑے۔''

مَجْذُوْذٌ: توڑا ہوا، کاٹا ہوا۔ زیر مطالعہ آیت ۱۰۸۔

ترکیب

(آیت ۱۰۵) یَاْتِ دراصل یَاْتِیْ ہے، کیونکہ یہاں پر جوازمِ مضارع میں سے کوئی عامل نہیں آیا ہے۔ یہاں پر اس کو ''ی'' گرا کر لکھنا قرآن مجید کی مخصوص املا ہے۔ تَكَلَّمُ واحد مؤنث کا صیغہ تَتَكَلَّمُ ہے۔ (آیت ۱۱۱) لَمَّا کے بعد ایک فعل محذوف ہے جو بُعِثُوْا یا حُشِرُوْا ہو سکتا ہے۔ کبھی لَمَّا بمعنی اِلَّا (مگر) بھی ہوتا ہے۔ ﴿اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَیْهَا حَافِظٌ ④﴾ (الطارق) ''نہیں ہے ہر ایک جان مگر ہے اُس پر نگران۔''

ترجمہ:

یَوْمَ یَاْتِ: جس دن وہ (دن) آئے گا

لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ: تو بات نہیں کرے گی کوئی جان

اِلَّا بِاِذْنِہٖ: مگر اُس (اللہ) کی اجازت سے
وَّسَعِیْدٌ: اور کوئی نیک بخت ہوگا
شَقُوْا: بدبخت ہوئے
لَھُمْ فِیْھَا زَفِیْرٌ: یقیناً وہ لوگ اس میں آہیں بھرنے والے ہیں
خٰلِدِیْنَ فِیْھَا: ہمیشہ رہنے والے ہوتے ہوئے اس میں
السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ: آسمان اور زمین
رَبُّكَ: آپؐ کا رب
فَعَّالٌ: کر گزرنے والا ہے
وَاَمَّا الَّذِیْنَ: اور جہاں تک وہ لوگ ہیں جو
فَفِی الْجَنَّةِ: تو (وہ) جنّت میں ہیں

مَا دَامَتِ: جب تک رہیں
اِلَّا مَا شَآءَ: سوائے اس کے جو چاہے
عَطَآءً: بخشش ہوتے ہوئے
فَلَا تَكُ: پس آپؐ مت ہوں
مِّمَّا یَعْبُدُ: اس سے جس کی بندگی کرتے ہیں
مَا یَعْبُدُوْنَ: یہ لوگ بندگی نہیں کرتے
اٰبَآؤُھُمْ: ان کے آباء واَجداد
وَاِنَّا لَمُوَفُّوْھُمْ: اور بے شک ہم ضرور پورا پورا دینے والے ہیں ان کو
غَیْرَ مَنْقُوْصٍ: بغیر کوئی کمی کیا ہوا
مُوْسَی الْكِتٰبَ: موسیٰ کو کتاب
وَلَوْلَا كَلِمَةٌ: اور اگر نہ ہوتا ایک فرمان جو
مِنْ رَّبِّكَ: آپؐ کے ربّ (کی طرف) سے

فَمِنْھُمْ شَقِیٌّ: تو ان میں سے کوئی بدبخت ہوگا
فَاَمَّا الَّذِیْنَ: پھر جہاں تک وہ لوگ ہیں جو
فَفِی النَّارِ: تو (وہ) آگ میں ہیں
وَّشَھِیْقٌ: اور سسکیاں لینے والے ہیں

مَا دَامَتِ: جب تک رہیں
اِلَّا مَا شَآءَ: سوائے اس کے جو چاہے
اِنَّ رَبَّكَ: بے شک آپؐ کا رب
لِّمَا یُرِیْدُ: اُس کو جو وہ ارادہ کرتا ہے
سُعِدُوْا: نیک بخت ہوئے
خٰلِدِیْنَ فِیْھَا: ہمیشہ رہنے والے ہوتے ہوئے اس میں
السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ: آسمان اور زمین
رَبُّكَ: آپؐ کا رب
غَیْرَ مَجْذُوْذٍ: بغیر توڑی ہوئی
فِیْ مِرْیَةٍ: کسی شبہ میں
ھٰٓؤُلَآءِ: یہ لوگ
اِلَّا كَمَا یَعْبُدُ: مگر اس طرح جیسے بندگی کرتے تھے
مِّنْ قَبْلُ: پہلے سے
نَصِیْبَھُمْ: اُن کا حصّہ

وَلَقَدْ اٰتَیْنَا: اور بے شک ہم دے چکے ہیں
فَاخْتُلِفَ فِیْهِ: پھر اختلاف کیا گیا اس میں
سَبَقَتْ: پہلے ہوا
لَقُضِیَ بَیْنَھُمْ: تو ضرور فیصلہ کر دیا جاتا اُن کے درمیان

وَاِنَّهُمْ : اور یقیناً وہ
لَفِیْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِیْبٍ : ضرور ایک ایسے شک میں ہیں اس سے جو الجھا دینے والا ہے

وَاِنَّ كُلًّا لَّمَّا : اور یقیناً سب کے سب (جب جمع کیے جائیں گے)
لَیُوَفِّیَنَّهُمْ : تو لازماً پورا پورا دے گا اُن کو

رَبُّكَ : آپؐ کا رب
اَعْمَالَهُمْ : اُن کے اعمال (کا بدلہ)

اِنَّهٗ بِمَا یَعْمَلُوْنَ : یقیناً وہ اس سے جو وہ لوگ کرتے ہیں
خَبِیْرٌ : باخبر ہے

نوٹ ۱ : آیت ۱۰۷ میں جو الفاظ آئے ہیں ان سے یا تو عالَمِ آخرت کے زمین و آسمان مراد ہیں یا محض محاورہ کے طور پر ان کو دوام اور ہمیشگی کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ بہرحال موجودہ زمین و آسمان مراد نہیں ہو سکتے‘ کیونکہ قرآن کی رو سے یہ قیامت کے روز بدل ڈالے جائیں گے اور یہاں جن واقعات کا ذکر ہو رہا ہے وہ قیامت کے بعد پیش آنے والے ہیں۔ اس میں استثناء کا مطلب یہ ہے کہ کوئی اور طاقت ایسی نہیں ہے جو ان لوگوں کو اس دائمی عذاب سے بچا سکے۔ البتہ اللہ تعالیٰ خود ہی کسی کے انجام کو بدلنا چاہے یا کسی کو ہمیشگی کا عذاب دینے کے بجائے ایک مدت تک عذاب دے کر معاف کر دینے کا فیصلہ فرمائے تو ایسا کرنے کا اُسے پورا اختیار حاصل ہے۔ (تفہیم القرآن)

نوٹ ۲ : آیت ۱۰۸ میں جو استثناء ہے اس سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ جنتی لوگوں کے احوال و مراتب میں تبدیلیاں ہوں گی‘ لیکن یہ تبدیلیاں خیر سے شر کی طرف کی نوعیت کی نہیں‘ بلکہ خوب سے خوب تر کی طرف ہوں گی‘ کیونکہ ان کو جنّت کبھی منقطع نہ ہونے والے عطیہ (عَطَآءً غَیْرَ مَجْذُوْذٍ) کی حیثیت سے ملے گی۔ (تدبر قرآن)

آیات ۱۱۲ تا ۱۱۷

﴿فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ؕ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ﴿۱۱۲﴾
وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۙ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِیَآءَ
ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَیِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّیْلِ ؕ اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ
السَّیِّاٰتِ ؕ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِیْنَ ﴿۱۱۴﴾ وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۱۱۵﴾
فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِیَّةٍ یَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِی الْاَرْضِ اِلَّا
قَلِیْلًا مِّمَّنْ اَنْجَیْنَا مِنْهُمْ ۚ وَاتَّبَعَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مَآ اُتْرِفُوْا فِیْهِ وَكَانُوْا مُجْرِمِیْنَ ﴿۱۱۶﴾
وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِیُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ ﴿۱۱۷﴾﴾

ز ل ف

زَلَفَ یَزْلُفُ (ن) زَلْفًا : نزدیک ہونا‘ قریب ہونا۔

زُلْفَةٌ ج زُلَفٌ :(۱) نزدیکی' قربت۔ ﴿فَلَمَّا رَاَوْهُ زُلْفَةً﴾ (الملک :۲۷) ''پھر جب وہ دیکھیں گے اس کو قریب میں۔'' (۲) کسی چیز کا وہ حصّہ جو کسی چیز کے نزدیک ہو' جیسے رات کا وہ حصّہ جو دن کے نزدیک ہو' یعنی سورج غروب ہونے کے بعد اور طلوع ہونے سے پہلے کا حصّہ۔ زیر مطالعہ آیت ۱۱۴۔

زُلْفٰی (فُعْلٰی کے وزن پر افعل التفضیل) : زیادہ یا سب سے نزدیک' قریب۔ ﴿وَمَآ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ بِالَّتِیْ تُقَرِّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰی﴾ (سبا:۳۷) ''اور نہیں ہیں تمہارے مال اور نہ ہی تمہاری اولاد وہ جو قریب کرتے ہیں تم کو ہمارے پاس زیادہ قریب۔''

اَزْلَفَ (افعال) اِزْلَافًا: نزدیک کرنا' قریب کرنا۔ ﴿وَاَزْلَفْنَا ثَمَّ الْاٰخَرِیْنَ ﴿۶۴﴾﴾ (الشعراء) ''اور ہم نے نزدیک کیا وہیں پر دوسروں کو۔''

ت ر ف

تَرِفَ یَتْرَفُ (س) تَرَفًا: خوشحال ہونا' عیش و آرام میں ہونا۔

اَتْرَفَ (افعال) اِتْرَافًا: خوشحالی دینا۔ زیر مطالعہ آیت ۱۱۶۔

مُتْرَفٌ (اسم المفعول) : جس کو خوشحالی دی گئی' خوشحال۔ ﴿اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُتْرَفِیْنَ ﴿۴۵﴾﴾ (الواقعة) ''بے شک وہ لوگ تھے اس سے پہلے خوشحال۔''

ترکیب

(آیت ۱۱۴) طَرَفَیِ دراصل طَرَفٌ کا تثنیہ طَرَفَانِ تھا۔ پھر ظرف ہونے کی وجہ سے حالتِ نصب میں طَرَفَیْنِ ہوا اور مضاف ہونے کی وجہ سے نون اعرابی گرا تو طَرَفَیِ استعمال ہوا اور آگے ملانے کے لیے ی کو کسرہ دی گئی۔ زُلَفًا بھی ظرف ہونے کی وجہ سے حالتِ نصب میں ہے۔

ترجمہ:

فَاسْتَقِمْ: پس آپؐ سیدھے رہیں (یعنی ڈٹے رہیں)	كَمَآ اُمِرْتَ: جیسے کہ آپؐ کو حکم دیا گیا
وَمَنْ: اور وہ (بھی) جنہوں نے	تَابَ مَعَكَ: توبہ کی آپؐ کے ساتھ
وَلَا تَطْغَوْا: اور تم لوگ سرکشی مت کرو	اِنَّهٗ: بے شک وہ
بِمَا تَعْمَلُوْنَ: اس کو جو تم کرتے ہو	بَصِیْرٌ: دیکھنے والا ہے
وَلَا تَرْكَنُوْٓا: اور تم لوگ مت مائل ہو	اِلَى الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا: ان کی طرف جنہوں نے ظلم کیا
فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ: ورنہ چھولے گی تم کو آگ	وَمَا لَكُمْ: اور نہیں ہے تمہارے لیے
مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ: اللہ کے علاوہ	مِنْ اَوْلِیَآءَ: کوئی بھی کارساز

ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ: پھر تم کو مدد نہیں دی جائے گی	وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ: اور آپؐ قائم رکھیں نماز کو
طَرَفَيِ النَّهَارِ: دن کے دونوں کناروں پر	وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ: اور کچھ حصوں میں رات میں سے
اِنَّ الْحَسَنٰتِ: یقیناً نیکیاں	يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ: لے جاتی ہیں بُرائیوں کو
ذٰلِكَ ذِكْرٰى: یہ ایک بڑی نصیحت ہے	لِلذّٰكِرِيْنَ: یاد رکھنے والوں کے لیے
وَاصْبِرْ: اور آپؐ ثابت قدم رہیں	فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ: تو یقیناً اللہ ضائع نہیں کرتا
اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ: خوبصورتی سے کام کرنے والوں کے اجر کو	فَلَوْلَا كَانَ: تو کیوں نہ ہوا کہ ہوتے
مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ: اُمتوں میں سے تم سے پہلے	اُولُوْا بَقِيَّةٍ: ایسے باقی رہنے والے (یعنی اہل خرد) جو
يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ: منع کرتے نظم بگاڑنے سے	فِي الْاَرْضِ: زمین میں
اِلَّا قَلِيْلًا: سوائے تھوڑے سے لوگوں کے	مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا: ان میں سے جن کو ہم نے نجات دی
مِنْهُمْ: ان (قوموں) میں سے	وَاتَّبَعَ: اور پیچھے لگے
الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا: وہ لوگ جنہوں نے ظلم کیا	مَآ اُتْرِفُوْا فِيْهِ: اس کے جو اُن کو خوشحالی دی گئی جس میں
وَكَانُوْا مُجْرِمِيْنَ: اور وہ تھے جرم کرنے والے	وَمَا كَانَ رَبُّكَ: اور نہیں ہے آپؐ کا رب
لِيُهْلِكَ الْقُرٰى: کہ وہ ہلاک کرے بستیوں کو	بِظُلْمٍ: کسی ظلم سے
وَّاَهْلُهَا: حالانکہ اس کے لوگ	مُصْلِحُوْنَ: اصلاح کرنے والے ہوں

نوٹ ۱: آیت ۱۱۴ کی ہدایت اس زمانے کی ہے جب نماز کے لیے ابھی پانچ وقت مقرر نہیں کیے گئے تھے۔ معراج کا واقعہ اس کے بعد پیش آیا جس میں پانچ وقت کی نماز فرض ہوئی۔ (تفہیم القرآن)

نوٹ ۲: صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ پانچ نمازیں اور ایک جمعہ دوسرے جمعہ تک اور ایک رمضان دوسرے رمضان تک ان تمام گناہوں کا کفارہ ہو جاتے ہیں جو ان کے درمیان صادر ہوں جبکہ یہ شخص کبائر یعنی بڑے گناہوں سے بچا رہا ہو۔ روایاتِ حدیث میں جتنے واقعات کفارہ ہو جانے کے منقول ہیں ان سب میں یہ بھی ہے کہ ان کا کرنے والا جب اپنے فعل پر نادم ہو اور آئندہ کے لیے توبہ کرے۔ (معارف القرآن)

نوٹ ۳: آیت ۱۱۶ میں کسی قوم کے اہلِ خرد اور سمجھ دار لوگوں کو لفظ اُولُوا بَقِيَّةٍ سے تعبیر کیا گیا ہے، کیونکہ انسان اپنی عزیز و محبوب چیز کو ہر حال میں محفوظ رکھنے کا اہتمام کرتا ہے اور انسان کو اپنی عقل و بصیرت سب سے زیادہ عزیز ہے، اس لیے اس کو بَقِيَّة کہا جاتا ہے۔ (معارف القرآن)

نوٹ ۴: آیات ۱۱۶۔۱۱۷ میں ان قوموں کی تباہی کے اصل سبب پر روشنی ڈالی گئی ہے جن کی تاریخ گزشتہ چھ رکوعوں میں بیان ہوئی ہے۔ اس تاریخ پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا جا رہا ہے کہ صرف انہی قوموں کو نہیں' بلکہ انسانی تاریخ میں جتنی قومیں بھی تباہ ہوئی ہیں' ان سب کو جس چیز نے گرایا وہ یہ تھی کہ جب اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی نعمتوں سے سرفراز کیا تو وہ خوشحالی کے نشے میں مست ہو کر زمین میں فساد برپا کرنے لگیں اور ان کی اجتماعیت اس درجہ بگڑ گئی کہ یا تو ان کے اندر ایسے لوگ باقی رہے ہی نہیں جو اُن کو بُرائیوں سے روکتے' یا وہ اتنے کم تھے کہ ان کے روکنے سے فساد نہ رک سکا۔ یہی چیز ہے جس کی بدولت یہ قومیں اللہ تعالیٰ کے غضب کی مستحق ہوئیں' ورنہ اللہ کو اپنے بندوں سے دشمنی نہیں ہے کہ وہ بھلے کام کر رہے ہوں اور اللہ اُن کو عذاب میں مبتلا کر دے۔ (تفہیم القرآن)

آیات ۱۱۸ تا ۱۲۳

﴿وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ﴿۱۱۸﴾ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ؕ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ ؕ وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَاَمْلَـَٔنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۱۹﴾ وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ ۚ وَجَآءَكَ فِيْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَّذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۲۰﴾ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ ؕ اِنَّا عٰمِلُوْنَ ﴿۱۲۱﴾ وَانْتَظِرُوْا ۚ اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ ؕ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۳﴾﴾

ترجمہ:

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ: اور اگر چاہتا آپؐ کا رب
اُمَّةً وَّاحِدَةً: ایک (ہی) اُمّت
مُخْتَلِفِيْنَ: اختلاف کرنے والے
رَّحِمَ رَبُّكَ: رحم کیا آپؐ کے رب نے
وَتَمَّتْ: اور تمام ہوا
لَاَمْلَـَٔنَّ جَهَنَّمَ: مَیں لازماً بھر دوں گا جہنّم کو
اَجْمَعِيْنَ: سب سے
نَّقُصُّ عَلَيْكَ: ہم بیان کرتے ہیں آپؐ پر
مَا نُثَبِّتُ بِهٖ: وہ ہم جماتے ہیں جس سے
لَجَعَلَ النَّاسَ: تو ضرور بنا تا لوگوں کو
وَّلَا يَزَالُوْنَ: اور ہمیشہ رہیں گے
اِلَّا مَنْ: سوائے اُس کے جس پر
وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ: اور اس کے لیے ہی اُس نے پیدا کیا ان کو
كَلِمَةُ رَبِّكَ: آپؐ کے رب کا فرمان (کہ)
مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ: جنّوں اور انسانوں سے
وَكُلًّا: اور سب کچھ
مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ: رسولوں کی خبروں میں سے
فُؤَادَكَ: آپؐ کے دل کو

وَجَآءَكَ: اور آ چکا آپؐ کے پاس	فِيْ هٰذِهِ: اس (سورہ) میں
الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ: حق اور نصیحت	وَّ ذِكْرٰى: اور بڑی یاد دہانی
لِلْمُؤْمِنِيْنَ: ایمان لانے والوں کے لیے	وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ: اور آپؐ کہہ دیجیے ان سے جو
لَا يُؤْمِنُوْنَ: ایمان نہیں لاتے	اعْمَلُوْا: تم لوگ عمل کرو
عَلٰى مَكَانَتِكُمْ: اپنی جگہ پر	اِنَّا عٰمِلُوْنَ: بے شک ہم (بھی) عمل کرنے والے ہیں
وَانْتَظِرُوْا: اور تم لوگ انتظار کرو	اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ: بے شک ہم بھی انتظار کرنے والے ہیں
وَلِلّٰهِ: اور اللہ ہی کے ہیں	غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: زمین اور آسمانوں کے غیب
وَاِلَيْهِ يُرْجَعُ: اور اُسی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں	الْاَمْرُ كُلُّهٗ: تمام معاملات سب کے سب
فَاعْبُدْهُ: پس آپؐ بندگی کریں اُس کی	وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ: اور آپؐ بھروسہ کریں اُس پر
وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ: اور آپؐ کا ربّ غافل نہیں ہے	عَمَّا تَعْمَلُوْنَ: اُس سے جو تم عمل کرتے ہو

نوٹ: آیت ۱۱۸۔۱۱۹ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اگر چاہتا تو سب کو ایک اُمّت بنا سکتا تھا' لیکن اُس نے ہدایت اور گمراہی کے معاملہ میں اس چیز کو پسند نہیں فرمایا' بلکہ اُس نے نیکی اور بدی دونوں کو اُن کے انجام کی تفصیل کے ساتھ لوگوں کے سامنے رکھ دیا ہے اور انہیں اختیار دیا ہے کہ وہ ان میں سے جس کو چاہیں اختیار کر لیں۔ ﴿وَلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ﴾ یعنی جب اللہ نے لوگوں کو اختیار دے دیا تو یہ توقع نہیں کرنی چاہیے کہ ہر شخص نیکی ہی کی راہ اختیار کرے گا' بلکہ ایسے بھی نکلتے رہیں گے جو تعلیم و تذکیر کے باوجود اپنے نفس کی پیروی میں بدی کی راہ اختیار کریں گے۔ اور بدی کی راہ اختیار کرنے سے وہی لوگ محفوظ رہیں گے جن پر تیرے رب کی رحمت ہو۔ یہ بات واضح ہے کہ رحمت خداوندی کے سزاوار وہی ہو سکتے ہیں جو عقل و فہم کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھائیں اور ان صلاحیتوں کے ہوتے ہوئے ٹھوکریں نہ کھائیں۔ ﴿وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ﴾ یعنی اللہ نے لوگوں کو اسی لیے پیدا کیا ہے کہ وہ اپنے اختیار اور انتخاب سے خود کو اللہ کے فضل اور رحمت کا سزاوار بنائیں۔ یہ امتحان انسان کی خلقت کا ایک لازمی جزو ہے۔ پھر جو لوگ اس امتحان میں فیل ہو جائیں گے ان کے حق میں اللہ تعالیٰ کی یہ بات پوری ہو کر رہے گی کہ وہ جہنّم کو جنوں اور انسانوں سے بھر دے گا۔ (تدبّرِ قرآن)

❀❀❀

جدید ریاست، مسائل اور امکانات

مکرم محمود

(درج ذیل تحریر محترم محمد دین جوہر صاحب کے مضمون ''جدید ریاست اور ہماری مذہبی خوش فہمیاں'' پر اصلاً اور حرفِ اوّل میں ذکر کردہ پوسٹ پر ضمناً طالب علمانہ نقد وتبصرہ ہے۔)

ایک صاحبِ علم کے بیانِ مسئلہ (یعنی جدیدیت کی پیدا کردہ صورتحال) سے کم وبیش اتفاق کرتے ہوئے ان کے پیش کردہ حل پر کچھ اشکالات اور کچھ اپنی معروضات پیش خدمت ہیں۔ جدیدیت کی آمد کے بعد سے ایک نئے شجرۂ وجود کی پیدائش ایک امر واقعی ہے جو ماقبل سے انقطاع وافتراق کی حالت میں، مانند ایک اژدھے کے، تمام روایتی معاشروں اور مذاہب کو نگل گیا ہے، اسلام کے جزوی استثناء کے ساتھ کہ اسلام اپنی اصل تعلیمات اور متن کے اعتبار سے تو محفوظ ہے مگر اپنی اجتماعی اور تہذیبی ہیئت میں تقریباً مفقود ہے۔ اس سے اختلاف کرنا کہ ہم ایک ایسے عہد میں جی رہے ہیں جو نہایت غیر معمولی اور قیامت آثار ہے جنت الحمقاء میں رہنے کے مترادف ہے۔ مشین، آرگنائزیشن اور ریاست جدیدیت کے پیدا کردہ شجرۂ وجود کے ہی پھل ہیں، انہوں نے ارضی فطرت کو اپنی اصل پر باقی نہیں رکھا اور ہدایت اور وجود کے تعلق کو مضمحل کر دیا ہے۔ یہ انسانوں کو بھی اپنے بنائے ہوئے سانچوں میں ڈھال رہے ہیں۔ یہیں سے ''سسٹم'' کا مفہوم سمجھ میں آتا ہے کہ وہ ایک ایسا ہمہ گیر اور کلی مظہر جدیدیت ہے جس کی دسترس سے کوئی بھی انسان اور معاشرہ خارج نہیں ہے۔ جدیدیت نے ایک نئی human and world condition کو جنم دیا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صاحب تحریر نے جدیدیت کی پیدا کردہ اس صورتحال کا جو حل اپنی تحریر ''جدید ریاست اور ہماری مذہبی خوش فہمیاں'' میں پیش کیا ہے، وہ ان کی پیش کردہ معروضات سے مطابقت رکھتا ہے یا نہیں۔ ہمیں یوں لگتا ہے کہ جدیدیت کے پیدا کردہ جہانِ تازہ اور اس کے نتیجے میں جنم لینے والی نئی اور انوکھی صورتحال کی منظر کشی بہت حد تک (مطابق نفس الامر ہونے کے) یوں کی گئی ہے کہ گویا اس کا کوئی حل اور اس سے رستگاری ممکن نہیں۔ اس پورے منظر نامے میں انسانی ارادہ کی بے بسی ظاہر ہے۔ اس وجہ سے ہمیں ان کی پیش کردہ معروضات اور حل میں کچھ تضادات نظر آتے ہیں اور کچھ سوالات بھی پیدا ہوتے ہیں۔ ہمیں اپنی باریک بینی اور نکتہ شناسی کا زعم نہیں۔ تضادات کا نظر آنا اور سوالات کا پیدا ہونا ہمارے قلتِ فہم وتدبر کا نتیجہ بھی ہوسکتا ہے۔ بحر حال ان میں سے کچھ سوالات پیش خدمت ہیں۔ (صاحب تحریر کے اقتباسات ہم نے نقل نہیں کیے۔ جو لوگ دیکھنا چاہیں اصل تحریر سے رجوع کریں۔)

جب یہ صورتحال تقدیری ہے اور انسانی اختیار سے خارج ہے، جیسا کہ جناب فرماتے ہیں، تو پھر اس کا کوئی

حل پیش کرنا چہ معنی دارد؟ بس شعوری ردّوقبول کا اختیار ہے‘ اس کو حل کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ ریاست سسٹم ہی کا مظہر ہے۔ اگرچہ یہ مظہر خود مخفی ہے کہ ریاست ہوتی کیا ہے اس پر آج تک اہل علم کا اتفاق نہ ہو سکا۔ (یہ عجیب بات ہے کہ ظاہر اور مظہر دونوں مخفی ہیں اس لیے ان کو مترادفات کے طور پر بھی لیا جا سکتا ہے۔) اس بحث کی تفصیل میں جانے کا اس وقت موقع نہیں‘ مگر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ریاست سرمائے اور طاقت ہی کے تعلقات کا نام ہے‘ یعنی یہ ایک مجرد وجود ہے اور اس کا اظہار سرمائے اور طاقت کی صورت میں ہوتا ہے۔ حصولِ طاقت کے جدید ذرائع صاحب تحریر کے نزدیک آرگنائزیشن اور صنعتی منہج پیداوار ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سرمائے‘ طاقت‘ آرگنائزیشن اور صنعتی ذرائع پیداوار کو اختیار کر کے (جو تمام سسٹم یا ریاست ہی کے مظاہر ہیں) سیاسی خودمختاری کیونکر ممکن ہے؟ یہ خودمختاری یقیناً سسٹم ہی کی شرائط پر ہوگی اور سسٹم ہی کا خام مال بنے گی۔ ان سب کو اختیار کرنے کے نتیجے میں سسٹم کی جو تاثیرات انسانی نفس پر ہوں گی اور جو اخلاقی تحوّل ہوگا اس کے لیے کیا یہ کہہ دینا کافی ہے کہ آپ ’’اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ‘‘ اور مکارمِ اخلاق پر کاربند رہیں؟ جناب ہی فرماتے ہیں کہ جدید ریاست و سسٹم میں عمل صالح کے امکانات مخدوش ہیں اور میکانکی عمل نے انسانی عمل کی جگہ لے لی ہے تو اب انسانی عمل کے دوبارہ حصول کا ذریعہ کیا ہے؟ سوال یہ ہے کہ جدید ریاست کی تحدیدات کیسے قائم کی جائیں گی؟ اس کے لیے ایک آزاد اور خودمختار عمل درکار ہے جو تحدیدات قائم کرنے سے پہلے ممکن نہیں اور تحدیدات کے لیے بھی وہی درکار ہے۔ ایسی صورتحال میں کیا کیا جائے؟

جدید سسٹم کے سامنے انسانی اختیار و ارادہ کی شکستگی و محدودیت یقیناً بجا ہے‘ لیکن انسان بہرحال آزاد ہے اور یہی آزادی بنائے تکلیف ہے۔ انسانی ارادہ اجتماعی ہو یا انفرادی اپنے اظہار کے مواقع جبر کے ماحول میں بھی دریافت کر لیتا ہے۔ اس کے لیے طاقت کے جدید میکینکس کو سمجھنا نہایت ضروری ہے۔

طاقت کا قدیم تصوّر sovereignty کے تصوّر پر اپنی اساس رکھتا تھا اور یک مرکز تھا۔ ایک pyramid کی طرح طاقت کے مراتب کا ایک نظام تھا۔ بیسویں صدی میں طاقت کا disciplinary تصور سامنے آیا جو کثیر المرکزی اور تعلقاتی (relational) تھا۔ یہ دونوں طرح کے طاقت کے تصورات جبر اساس تھے اور انسانی آزادی کو سلب کرتے تھے۔ پہلا بہت ہی واضح اور دوسرا مخفی انداز میں۔ طاقت کا جدید تصوّر جسے smart power کا نام دیا گیا پچھلے بیس سال کی ٹیکنالوجی خاص طور پر سائبر ٹیکنالوجی میں ہونے والی تیز رفتار ترقی کے نتیجے میں سامنے آیا‘ وہ مطلق آزادی پر استوار ہے اور بظاہر جبر سے یکسر خالی ہے۔ اس کو کورین نژاد جرمن فلسفی بیان چل ہاں (Byung Chul Han) نے اس طرح کہا ہے کہ اب disciplinarian should کی جگہ freedom of can نے لے لی ہے۔ smart power کو اس طرح سے سمجھا جا سکتا ہے کہ انسان کوئی خواہش پالے یا کوئی خواب دیکھے اور وہ اس کو بالکل اپنا ذاتی سمجھے‘ حالانکہ وہ خواہش اس کے دل میں ڈالی گئی ہے اور وہ خواب اس کو دکھایا گیا ہے۔ گویا طاقت کا ایک لامرکزی غیر مرئی نظام..... آزادی کے مکمل احساس کے ساتھ! ایک بات ہمیں سمجھ لینی چاہیے کہ smart power کے آنے کا مطلب یہ نہیں ہے sovereignty اور

discipline کے تصوّرات اور خارجی دباؤ اور جبر مکمل طور پر ختم ہو گیا بلکہ یہ سب بیک وقت پائے جاتے ہیں۔ فرق غالب اور مغلوب کا ہے۔ پیار سے جب کام نہیں چلتا تو ڈنڈا بھی استعمال کیا جاتا ہے یعنی جب ضرورت پڑے ریاستی یا نظامی جبر برہنہ ہو کر سامنے آتا ہے۔ لیکن ایسا جبر سسٹم کی efficiency کے لیے نقصان دہ اور سسٹم کے چلتے پرزوں میں friction پیدا کرتا ہے اور تیز رفتار ترقی کو ممکن نہیں رہنے دیتا۔ اس کے علاوہ افراد کی طرف سے بغاوت کا خطرہ الگ ہوتا ہے۔ امکانات کو محدود کرنے کے بجائے لا انتہا امکانات سامنے لا کر ڈرانے کے بجائے، خوشنما خواب دکھا کر، زبانوں پر تالے ڈالنے کے بجائے 'سب کہہ دو' کی نفسیات پیدا کر کے انسانوں کو جس طرح کنٹرول کیا جا سکتا ہے اور کیا جا رہا ہے جبر کے ذریعے اس کا عُشرِ عشیر بھی ممکن نہیں ہے۔ اسی کا نام سمارٹ پاور ہے۔ سمارٹ فون سمارٹ پاور ہی کا ایک مظہر ہے۔ لامحدود امکانات کو سامنے لانا اور 'سب کہہ دو جو بھی کہیں بھی' کو ممکن بنانا پچھلے پندرہ بیس سال میں ہونے والی سائبر ٹیکنالوجی میں ترقی کے بغیر قطعی ناممکن تھا۔ ہم information age اور hyperreal world میں جیتے ہیں جس کا دروازہ سکرین ہے اور اس سے باہر کی دنیا بہت ہی سست اور بدمزہ سی ہے۔ ایسی صورتحال کا سامنا انسان نے کبھی نہیں کیا۔ آج کی انسانی صورتحال کو آج سے چالیس سال پہلے پر قیاس کرنا بہت مشکل ہے۔ جدید انسان کے لیے سب سے بڑا مسئلہ سائبر ٹیکنالوجی نے کھڑا کیا ہے، اس بات کا ادراک جتنی جلدی کر لیا جائے اتنا اچھا ہے۔ پرانی باتیں کرتے رہنا اور صرف کچھ isms کا نام لیتے رہنا کوئی کارآمد طرزِ عمل نہیں ہے۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ ان (Modernism, ism Rationlism, Feminism, Secularism, Postmodernism Etc) کا تذکرہ اور ان کو موضوع بنانا اس وقت بھی یقیناً ضروری اور مفید ہے مگر اس صورت میں کہ ان کو حاضر و موجود صورتحال سے متعلق کر کے دیکھا جائے، کیونکہ اس وقت کی صورتحال انہی کا ایک انتہائی نتیجہ اور شکل ہے، فکریات منقولات نہیں ہیں۔ ان تصوّرات نے جس سسٹم کو جنم دیا ہے وہ ایک بدلتا ہوا معروض ہے اور اس کے ادراک کے لیے ایک حرکی فکر درکار ہے۔

اگرچہ یہ پہلے سے زیادہ خطرناک صورتحال ہے اور انسانوں کی اکثریت کے لیے زیادہ تباہ کن ہے لیکن اُن لوگوں کے لیے انفرادی اور اجتماعی عمل کی کچھ گنجائش بھی اس کے نتیجے میں پیدا ہو گئی ہے جو جدید سسٹم کے میکینکس اور اس کے اندرونی تضادات سے واقف ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس سے سسٹم کو intelligently manipulate کرنے کے امکانات بڑھ گئے ہیں ان کے لیے جو جدید ریاستی نظام کا نظری فہم رکھتے ہیں، اس میں پائے جانے والے loopholes سے واقف ہیں اور کچھ کرنے کا جذبہ رکھتے ہیں۔ کھلم کھلا اعلانِ بغاوت اور سسٹم یا ریاست کو چیلنج کرنا جو ایک مجرد وجود ہے، کوئی مفید طرزِ عمل نہیں ہے۔ وجود غائب سے لڑنا کیونکر ممکن ہے؟ سمجھداری سے چور راستوں کو تلاش کرنا، دیے گئے مواقع کو بھرپور استعمال کرنا، سسٹم کے اندرونی تضادات کو نمایاں کرتے رہنا اور آہستہ آہستہ آگے بڑھنا فی الحال یہی کیا جا سکتا ہے اور اسی کا انسان مکلّف ہے۔ کامیابی کی ضمانت نہیں ہے مگر انفرادی اور اجتماعی عمل کی

گنجائش یقیناً موجود ہے۔لیکن بارِ دگر عرض ہے کہ یہ کام وہی لوگ کر سکتے ہیں جو جدید نظام کی نظری تفہیم رکھتے ہوں' مضبوط ارادے اور اخلاقی وجود کے حامل ہوں۔

جدید طاقتی نظام کی انسانی باطن پر تاثیرات عجیب وغریب ہیں۔گویا صبح وشام فتنے ٹپک پڑتے ہیں اور یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ انسانی تاریخ میں اس کی نظیر معدوم ہے۔اگر کوئی کہے کہ ہر دور میں لوگ ایسا ہی کہا کرتے تھے تو ہم یہ کہیں گے کہ بھائی آپ کو اگر مغرب کے پچھلے دو سو سال کے پوری دنیا پر استیلاء کے اثرات نظر نہیں آتے اور اب پچھلے دس بیس سال سے ہونے والی سائبر ٹیکنالوجی کی ترقی اور اس کے نتیجے میں ایک مکمل طور پر بدلی ہوئی human condition اور انسانی تعلقات وتعاملات کا ایک پورا بدلا ہوا منظر نامہ نظر نہیں آتا تو پھر ہم معافی چاہتے ہیں' آپ سے مکالمہ ممکن نہیں۔آپ کارِ دگر میں دل بہلائیے۔

باقی جو لوگ باطل نظام کے خلاف محاذ پر اپنے تئیں سرگرم ہیں اور تصورِ نفاذِ دین اسلام کا علَم بلند کیے رکھتے ہیں' اگرچہ یہ بات درست ہے کہ وہ نظام کی نظری تفہیم کے تقاضے پورے نہیں کرتے اور جدید سماجی اور طاقتی (سیاسی) صورتحال میں نفاذ کا کیا مطلب ہے اور نفاذ نفوذ کے بغیر کیسے متصور ہے اس کا کوئی تسلی بخش جواب دینے سے قاصر ہیں' مگر پھر بھی ان کی دینی حمیت' جذبہ اور بہت سی خدمات قابل تعریف ہیں۔مثال کے طور پر سیکولرزم کی یلغار کے سامنے جب دین کی اجتماعی جہت نظر انداز کی جارہی ہو مسلسل اس بات کی منادی کرتے رہنا کہ دین فرد' معاشرے اور ریاست سے بیک وقت متعلق ہے اور انسانی زندگی کے جملہ پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔مراتب اور ترجیحات کے تعین اور تعبیر میں یقیناً اختلاف ممکن ہے مگر ان کی اس خدمت سے انکار احسان فراموشی ہے۔اسی طرح تحریکی اور انقلابی مزاج والے حضرات کو ایک دینی پلیٹ فارم مہیّا کرنا یہ بھی ایک دینی خدمت ہے۔علمی میدان میں یقیناً ان پر تنقید کی جاسکتی ہے مگر طنز واستہزاء مناسب نہیں۔

نفوذ ایک عمل سریانی ہے جو انسانی ظاہر وباطن اور معاشرے سے متعلق ہے۔دین انسانی باطن میں سرایت کر جاتا ہے اور عمل جوارح میں اپنا ظہور کرتا ہے۔ایسے سرایتی نفوس کے باہمی تعاملات کے نتیجے میں دین چھوٹے سماجی اور معاشرتی اداروں کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔یوں ایک غیر سرمایہ دارانہ فرد اور غیر سرمایہ دارانہ معاشرہ مائیکرو لیول پر وجود میں آتا ہے۔نفاذ ایک اوپر سے کیے جانے والا عمل ہے اور اس میں ایک گونہ جبر کا عنصر ہے۔شروع میں نفوذ اور بعد میں نفاذ اور نفوذ دونوں پر محنت ہو تو یقیناً نتیجہ خیز ہو سکتی ہے۔نفوذ کے عمل سریانی کو اگر ریاستی چھتری نصیب نہ ہو تو نفوذ کا عمل بھی مکمل نہیں ہو پائے گا اور مستقل ایک کشیدگی اور اٹکاؤ کی صورت ہوگی۔مگر محنت کا آغاز اور اصل سعی بالضرور نفوذ پر کی جائے گی۔نفاذ پر عرق ریزی بغیر نفوذ پر محنت کے کارِ لاحاصل ہے' جبکہ نفوذ کی تگ ودو بغیر نفاذ پر جاں فشانی کے کارِ نامکمل ہے۔نفاذ کی دوڑ دھوپ بغیر سسٹم کی تفہیم کے عبث ہے۔جدید سسٹم فرد' معاشرہ اور ریاست ان سب کا احاطہ کرتا ہے۔سسٹم کے ایک ایسے ہمہ گیر تسلّط کے بعد بغیر وقوف کے دین کے نفاذ کی بات کرنا اور حاضر وموجود نظام ہی کے اندر کچھ جزوی ترمیمات کو انقلاب سمجھنا نظام کی اساسی سوجھ

بوجھ اور تہذیبی حرکیات سے ناواقفیت پر دلالت کرتا ہے۔

صاحبِ تحریر نے جو نفس مسئلہ کا بیان کیا ہے اور سسٹم کی نظری تفہیم کی ضرورت پر زور دیا ہے اس سے کافی حد تک اتفاق ہے، مگر اس بیانیے میں کسی قدر یاسیت کی بو آتی ہے اور سسٹم خدا کی طرح اور انسانی اختیار و ارادہ (چاہے انفرادی ہو یا اجتماعی) کچھ سلب ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کا پیش کردہ حل کچھ داخلی تضادات بھی رکھتا ہے اور اس کے نتیجے میں کچھ مزید سوالات بھی پیدا ہوتے ہیں جن کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے۔ بنیادی بات یہ ہے کہ انسان بحیثیت عبد کچھ انفرادی و اجتماعی ذمہ داریوں کا مکلف ہے۔ اپنے دائرۂ اختیار میں رہتے ہوئے ان ذمہ داریوں کی ادائیگی اس پر لازم ہے۔ دین انسانی نفس اور معاشرے میں ایک تبدیلی لے کر آتا ہے۔ اس کے بعد ریاستی طاقت کا حصول یہ انسانی ارادہ و اختیار سے زیادہ خدا کے ایک تکوینی نظام سے متعلق ہے (انسانی ارادہ و اختیار سے کلیتاً غیر متعلق نہیں ہے اور نہ اس کے لیے کوشش بیکار ہے، لیکن اس کے لیے دورِ حاضر اور اس کے سماجی و سیاسی سسٹم کی تفہیم اور intelligent manipulation درکار ہے اور یہ یقیناً کچھ لوگوں کے کرنے کا کام ہے۔) مسلمانوں کو بحیثیت قوم دیکھنا اور اس بات پر پچھتانا کہ وہ تاریخی دھارے میں کوئی قابل ذکر رول ادا کرنے کے قابل نہیں رہے اس کی اپنی ایک اہمیت ہے اور علمی اور فکری دنیا میں اس کے اسباب اور طرق تدارک پر یقیناً بات کی جا سکتی ہے اور کی بھی جانی چاہیے، لیکن خالص دینی اساس پر بنا ہوا ذہن اور تراشیدہ طبیعت کے لیے یہ ایک تناظر تو یقیناً ہے لیکن ثانوی ہے۔ اس طرح کا ذہن ایک کُلّی تناظر رکھتا ہے جو اس دنیا کو حیاتِ مابعد سے کاٹ کر دیکھنے کا عادی نہیں ہوتا۔ دنیا کا مکانِ آزمائش اور مہلتِ عمر کا زمانِ ابتلاء ہونا اس کے شعور سے محو نہیں ہوتا۔ کامیابی کو حیاتِ دُنیوی میں غلبہ سے مشروط نہیں سمجھتا لیکن وہ اپنے زمانے سے جاہل نہیں ہوتا، عارف بالزمان ہوتا ہے جس کا ہاتھ زمانے کی نبض پر ہوتا ہے۔

جہالت یقیناً ہمارا مسئلہ ہے۔ اسی وجہ سے اس طرح کے نظری مباحث مثلاً طاقت اور سرمائے کا تعلق، طاقت کا جدید تصوّر، ریاستی نظام کی حقیقت وغیرہ کی اہمیت دو چند ہو جاتی ہے اور اس طرح کے فکری مباحث کے لیے نظری اور فکری وسائل کی دستیابی بھی ضروری ہے، لیکن طنز، تمسخر، استہزاء اور جو لوگ بساط بھر اپنی سمجھ کے مطابق نظام کی سطح پر تبدیلی کے لیے کوشاں ہیں ان کو جاہل اور بیوقوف سمجھنا اہلِ علم کا شیوہ نہیں ہے۔ صاحبِ تحریر صاحب علم و فکر آدمی ہیں۔ ان سے سیکھنے کو ہم جیسے کم علم لوگوں کے لیے بہت کچھ ہے لیکن ان کے اس رویّے کو ہم مناسب نہیں سمجھتے۔ اسی طرح نفس مسئلہ سے تقریباً اتفاق کرتے ہوئے اس کے بیان میں کچھ شدت سی محسوس کرتے ہیں، مثلاً انسانی ارادہ و اختیار کی نابودیت کا تاثر اور تاریخی اور طبعی فطرت کا مکمل انہدام۔ اس طرح کے بیان کے بعد کسی حل کا امکان نہیں رہ جاتا۔ پھر جب وہ حل بتاتے ہیں تو ہم حیرت کا شکار ہوتے ہیں اور تضادات کو جنم لیتا ہوا اور سوالات کو پیدا ہوتا ہوا دیکھتے ہیں۔

اسلام اور سائنس

سائنسی علوم کی ایک مثالی اسلامی یونیورسٹی کی ضرورت (۲)

ڈاکٹر محمد رفیع الدین

مشاہدہ اور مطالعۂ قدرت کی قرآنی دعوت

قرآن نے مشاہدہ اور مطالعۂ قدرت پر کیوں زور دیا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کی تعلیم کا نچوڑ یہ ہے کہ خُدا کی محبّت انسان کی فطرت میں رکھی گئی ہے اور جب تک انسان خُدا کی ستائش، عبادت اور اطاعت کے ذریعہ سے خُدا کی محبّت کا اظہار نہ کرے اُس کی شخصیت نشوونما پا کر اپنے کمال کو نہیں پہنچ سکتی اور اِس زندگی میں اور آنے والی زندگی میں ان مسرتوں اور راحتوں کو نہیں پا سکتی جو اُس کے کمال کے ساتھ وابستہ ہیں۔ خُدا کی محبّت کے ذریعہ سے انسانی شخصیت کی تکمیل ہی مقصدِ کائنات ہے، لیکن خُدا کی محبّت جو انسان کی فطرت میں ہے خُدا کی معرفت کے بغیر بیدار نہیں ہوتی۔ اور خُدا کی معرفت حاصل کرنے کا طریق یہ ہے کہ انسان خُدا کی صنعت یعنی کائنات کو دیکھے، اس پر غور و فکر کرے اور اس کے ذریعہ سے اس کے صانع کے اوصاف، محاسن اور کمالات کو جانے اور پہچانے۔ کائنات کا خود بخود وجود میں آنا انسان کی سمجھ میں نہیں آ سکتا تو پھر جس ہستی نے کائنات پیدا کی ہے اس کے وجود اور صفات کی شہادت اس کائنات سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے!

﴿أَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ط﴾ (ابراھیم: ۱۰)

''کیا اللہ کے بارے میں شک ہے جو آسمانوں اور زمین کا خالق ہے؟''

صنعت کے اندر صانع کی تمام صفات جلوہ گر ہوتی ہیں اور اس کی صنعت سے اس کے مقاصد و عزائم اور اس کی قابلیتوں اور اہلیتوں کا پتہ چلتا ہے۔ اگرچہ خُدا کی شخصیت انسان کی آنکھوں سے مخفی ہے تاہم اس کی صفاتِ حسن کی کارفرمائیاں انسان کی آنکھوں کے سامنے آشکار ہیں۔ جسمانی اور مادّی آنکھوں سے مخفی رہنا شخصیت کا خاصہ ہے خواہ شخصیت انسان کی ہو یا خُدا کی۔ لیکن جس طرح ہمارے لیے کسی ایسے انسان کی شخصیت کو بھی جو بعد میں ہمارے جاننے اور پہچاننے کی وجہ سے ہمارا بہترین دوست بن جانے والا ہو، جاننے اور پہچاننے کی صرف یہی ایک صورت ہے کہ ہم اس کی اندرونی مخفی صفات کے مظاہر کا جو اس کے اعمال و افعال کی صورت اختیار کرتے ہیں، مشاہدہ اور مطالعہ کریں، اسی طرح سے خُدا کی شخصیت کو جاننے اور پہچاننے کی بھی صرف یہی ایک صورت ہے کہ ہم اس کی مخفی صفات کے مظاہر کا جو قدرت کے حالات و واقعات اور اعمال و افعال کی صورت اختیار کرتے ہیں، مشاہدہ اور مطالعہ کریں۔

خُدا کے خالق کائنات ہونے کے معنی یہ ہیں کہ خدا کائنات کے اندر اپنی صفات کے ذریعہ سے موجود ہے اور کائنات اور خُدا ایک دوسرے سے الگ الگ نہیں ہو سکتے۔ یہ کائنات سوائے اس کے اور کچھ بھی نہیں کہ خُدا کی صفات کی ایک مرئی شکل ہے۔ اگر خُدا کی صفات کا ظہور جو کائنات میں ہے غائب ہو جائے تو پوری کائنات ہی فنا ہو جاتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم جہاں مؤمنین سے یہ توقع رکھتا ہے کہ وہ اُٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے ہوئے خُدا کا ذکر کریں، وہاں ان سے اس بات کی بھی توقع رکھتا ہے کہ وہ کائنات کی تخلیق (خلق السمٰوٰت و الارض) پر غور و فکر کریں۔

﴿الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۹۱﴾﴾ (آل عمران)

''وہ لوگ جو اللہ کا ذکر کرتے ہیں کھڑے ہو کر اور بیٹھ کر اور اپنے پہلوؤں پر لیٹے ہوئے اور آسمانوں اور زمین کی تخلیق پر غور و فکر کرتے ہیں (یہاں تک کہ پکار اُٹھتے ہیں) اے ہمارے ربّ! یہ کائنات (جس میں ہم بھی ہیں اور جس کا ذرّہ ذرّہ تیری صفاتِ حسن کا آئینہ دار اور تیری خالقیت اور ربوبیت کا گواہ ہے) تُو نے اپنے سچے مقصد کے بغیر پیدا نہیں کی، پس ہمیں (کائنات کے اندر اپنے مقصد کے ساتھ اعتقادی اور عملی مطابقت کی توفیق عطا فرما کر) آگ کے عذاب سے بچائیو۔''

اور یہی وجہ ہے کہ قرآنِ حکیم مظاہرِ قدرت کو خُدا کی ہستی اور صفاتِ خالقیت و ربوبیت کی نشانیاں (آیات) کہتا ہے:

﴿اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۰﴾﴾ (آل عمران)

''اس میں شک نہیں کہ آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور رات اور دن کے اختلاف میں عقلمندوں کے لیے (خُدا کی ہستی اور صفات کی) نشانیاں ہیں۔''

﴿وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ ﴿۲۰﴾ وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۲۱﴾﴾ (الذّٰریٰت)

''اور یقین کرنے والوں کے لیے روئے زمین پر (خُدا کی ہستی اور صفات کے) بہت سے نشانات ہیں۔ اور تمہارے نفوس میں بھی۔ اور کیا تم دیکھتے نہیں ہو؟''

﴿وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ ۚ اَحْيَيْنٰهَا وَاَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا فَمِنْهُ يَاْكُلُوْنَ ﴿۳۳﴾﴾ (یٰسٓ)

''اور ایک نشانی ان کے لیے یہ ہے کہ ہم نے مُردہ زمین کو زندہ کیا اور اس سے دانے اُگائے جن کو وہ اپنی خوراک کے لیے استعمال کرتے ہیں۔''

﴿اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَاۗءِ مِنْ مَّاۗءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَاۗبَّةٍ ۠ وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاۗءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۴﴾﴾ (البقرۃ)

''بے شک آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور رات اور دن کے تغیر میں اور کشتی میں جو سمندر میں لوگوں کو نفع دینے والے تجارتی مال کو لے کر چلتی ہے' اور اس بات میں کہ اللہ تعالیٰ آسمان سے پانی نازل کرتا ہے پھر اس سے زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کر دیتا ہے' اور اس بات میں کہ اُس نے زمین کے اوپر ہر قسم کے جاندار پھیلا دیے ہیں' اور ہواؤں کی تبدیلیوں میں اور بادل میں جو آسمان اور زمین کے درمیان ٹھہرا دیا جاتا ہے' عقلمندوں کے لیے نشانات ہیں۔''

﴿وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَآ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ ۝۲۰ وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝۲۱﴾ (الروم)

''اور اُس کے نشانات میں سے ایک یہ ہے کہ تم کو مٹی سے پیدا کیا اور تم انسان بن کر زمین پر پھیل گئے۔ اور اُس کے نشانات میں سے ایک یہ ہے کہ اُس نے تم میں سے ہی تمہارے جوڑے پیدا کیے تاکہ تم اپنی بیوی سے سکونِ قلب حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت اور ہمدردی پیدا کی۔ بے شک اس بات میں غور کرنے والوں کے لیے نشانات ہیں۔''

﴿وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ ۝۲۲ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَاۗؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ۝۲۳﴾ (الروم)

''اور اُس کے نشانات میں سے آسمانوں اور زمین کی تخلیق اور تمہارے رنگوں اور زبانوں کا اختلاف ہے۔ بے شک اس میں اہلِ عالَم کے لیے نشانات ہیں۔ اور اُس کے نشانات ہی سے تمہارا دن اور رات کو سونا اور (رزق کی صورت میں) اُس کے فضل کی جستجو کرنا ہے۔ بے شک اس میں ان لوگوں کے لیے نشانات ہیں جو سنتے ہیں۔''

﴿وَاٰيَةٌ لَّهُمْ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ۝۴۱﴾ (یٰسٓ)

''اور اس بات میں ان کے لیے (خدا کی ہستی اور صفات کا) ایک نشان ہے کہ ہم نے ان کی اولاد کو بھری ہوئی کشتی میں سوار کر دیا۔''

حواس سے کام لے کر مظاہرِ قدرت کا مشاہدہ کرنا اور دل سے کام لے کر ان پر غور و فکر کرنا اور ان سے صحیح صحیح نتائج اخذ کرنا مسلمان پر فرض قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ ایسا کرنا قرآن کے نزدیک صحیح عقائد اور صحیح اعمال کی بنیاد ہے۔ جو لوگ آنکھیں تو رکھتے ہیں لیکن دیکھتے نہیں' کان تو رکھتے ہیں لیکن سنتے نہیں اور دل رکھتے ہیں لیکن سوچتے نہیں تو اُن کو چوپایوں سے بدتر اور عذابِ جہنّم کا مستحق قرار دیا گیا ہے:

﴿وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۡ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ۭ اُولٰۗىِٕكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ

هُمْ اَضَلُّ ؕ﴾ (الاعراف:۱۷۹)

''اور بے شک ہم نے بہت سے ایسے جن اور انسان دوزخ کے لیے پیدا کیے ہیں' جن کے دل ہیں لیکن ان سے سوچتے نہیں' اور جن کی آنکھیں ہیں لیکن ان سے دیکھتے نہیں' اور جن کے کان ہیں لیکن ان سے سنتے نہیں۔ یہ لوگ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ۔''

جو لوگ اپنے حواس سے کام نہیں لیتے اور اپنے دلوں سے نہیں سوچتے یا تعصب کی وجہ سے غلط سوچتے ہیں ان سے اپنی ان قوتوں کو ضائع کرنے کے بارے میں باز پرس کی جائے گی:

﴿اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا ۝۳۶﴾ (بنی اسراءیل)

''بے شک کان اور آنکھ اور دل ان سب کے بارے میں پوچھا جائے گا۔''

قرآن حکیم نے آسمانوں اور زمین میں مظاہر قدرت کو دیکھنے کے بعد ان پر غور و فکر کے بغیر آگے گزر جانے سے منع کیا ہے کہ ایسا کرنے سے خُدا کی معرفت کے مواقع ہاتھ سے نکل جاتے ہیں اور انسان کی محبّت اور شخصیت کا ارتقاء نہیں ہوتا۔

﴿وَ كَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَ هُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ۝۱۰۵﴾

(یوسف)

''اور آسمانوں اور زمین میں کتنے ہی نشانات (خُدا کی ہستی اور صفاتِ حسن کے) ایسے ہیں کہ یہ ان سے گزرتے ہیں تو منہ پھیر لیتے ہیں (اور ان پر غور و فکر نہیں کرتے)۔''

کسی مظہر قدرت یا آیت اللہ پر غور و فکر ترک کر دینا اس سے پہلے کہ اس کی حقیقت پوری طرح سے منکشف ہو یہ بھی اس سے اعراض ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان کو یہ حکم ہے کہ جب موجوداتِ قدرت میں سے کوئی چیز اس کے نوٹس میں آئے تو اسے نظر انداز نہ کرے' بلکہ اس کے مشاہدہ اور مطالعہ کا حق ادا کرے' اس کی حقیقت اور اصلیت کو پوری طرح سے سمجھے اور خُدا کی حکمتیں جو اس کے اندر پوشیدہ ہیں ان سے پوری طرح واقف ہونے کی کوشش کرے۔ گویا جب تک کسی چیز کی حقیقت پوری طرح سے واضح نہ ہو جائے' مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ اپنی تحقیق و تجسّس کو جاری رکھے۔ حضور اکرم ﷺ نے اُمّت کو ایک دعا سکھائی ہے جو اس مطلب کی تائید کرتی ہے:

((اَللّٰهُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اتِّبَاعَهٗ وَ اَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اجْتِنَابَهٗ ' اَللّٰهُمَّ اَرِنَا الْاَشْيَاءَ كَمَا هِيَ))[1]

''اے اللہ! ہم کو صداقت بطور صداقت کے دکھا اور اس کی پیروی کرنے کی توفیق دے' اور جھوٹ بطور جھوٹ کے دکھا اور اس سے بچنے کی توفیق عطا فرما۔ اے اللہ! ہمیں اشیاء کو اسی طرح سے دکھا جیسی وہ درحقیقت ہیں۔''

حضور ﷺ کی یہ دعا گویا سائنسی طریق تحقیق کی حمایت کرتی ہے' کیونکہ سائنسی طریق تحقیق جو اس بات پر زور دیتا

(۱) یہ ایک مشہور دعا ہے' لیکن کوشش کے باوجود کتب احادیث میں اس کی سند نہیں مل سکی۔ ابوطالب مکیؒ کی کتاب ''قوت القلوب'' میں اسے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی دعا کہا گیا ہے۔ (مدیر)

ہے کہ مشاہدہ کے نتائج کو کامل احتیاط سے اخذ کیا جائے اور انتہائی طور پر درست کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس کا مقصد یہی ہے کہ اشیاء ویسی ہی نظر آئیں جیسی کہ وہ درحقیقت ہیں۔

تفکّر فی الخلق کے قرآنی ارشاد پر عمل کا لازمی نتیجہ سائنسی علوم کی تخلیق اور تکمیل ہے

قرآن کی رُو سے خُدا کی خالقیّت اور ربوبیت کے نشانات کائنات کی تینوں سطحوں پر موجود ہیں۔ مادی دنیا کے مظاہر قدرت کی طرف توجّہ دلاتے ہوئے قرآن حکیم' چاند' سورج اور ستاروں کی حرکت کا' برق وسحاب کا' ہواؤں کے چلنے کا' اختلافِ لیل ونہار کا' مینہ برسنے کا' چاند کے گھٹنے بڑھنے کا' پہاڑوں کا' زمین کی ہموار سطح کا' پہلے آسمان اور زمین کے یکجا ہونے اور پھر الگ الگ ہونے کا اور اس طرح کے اور مظاہر قدرت کا ذکر کر کے ان کے مشاہدہ اور مطالعہ کی دعوت دیتا ہے۔ اگر ہم ان مظاہر قدرت کے مشاہدہ اور مطالعہ کا حق ادا کر کے ان کی حقیقت اور اصلیت کو پوری طرح سے سمجھ لیں اور ان کے تمام رموز واسرار سے اور خُدا کی ان تمام حکمتوں سے جو ان کے اندر پوشیدہ ہیں پوری طرح آگاہ ہو جائیں تو نتیجہ یہ ہوگا کہ تمام طبیعیاتی علوم (Physical Sciences) وجود میں آجائیں گے۔ اس کی وجہ' جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا' یہ ہے کہ تمام سائنسی حقائق ایک سلسلہ یا نظام بناتے ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ علمی اور عقلی ربط وضبط رکھتے ہیں اور ایک دوسرے کی طرف دلالت اور راہ نمائی کرتے ہیں۔

اسی طرح سے حیاتیاتی دنیا کے مظاہرِ قدرت کی طرف توجّہ دلاتے ہوئے قرآن حکیم زمین سے روئیدگی کے نمودار ہونے کا' لہلہاتی کھیتیوں کا' غلہ کے پیدا ہونے کا' مختلف رنگوں اور ذائقوں کے پھلوں کا' پانی سے ہر جاندار کے زندہ ہونے کا' کیچڑ سے انسان کی تخلیق کے آغاز کا' زمین سے نسل انسانی کے اُگنے کا' زمین میں ہر قسم کے جانداروں کے پھیل جانے کا' پرندوں کے اُڑنے کا' سواری کے کام آنے والے اور دودھ دینے والے چوپایوں کا' نباتات اور حیوانات کے ازواج کا' اونٹ کی حیرت انگیز جسمانی ساخت کا' انسان کی قوتِ فہم اور دید وشنید کا اور ماں کے رحم میں انسانی جنین کی حالتوں کے تدریجی تغیر کا' اور اسی طرح کے دوسرے مظاہر قدرت کا ذکر کر کے ان کے مشاہدہ اور مطالعہ کی دعوت دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر ہم ان مظاہر قدرت کا پورا مشاہدہ اور مطالعہ کریں' یہاں تک کہ ان کے تمام اسرار ورموز سے آشنا ہو جائیں' تو نتیجہ یہ ہوگا کہ تمام حیاتیاتی علوم (Biological Sciences) مکمل طور پر وجود میں آجائیں گے۔

پھر اسی طرح سے نفسیاتی یا انسانی دنیا کے مظاہر قدرت کی طرف توجّہ دلاتے ہوئے قرآن حکیم انسانی تاریخ کے بعض اہم واقعات اور قوانین کا اور انسانی فطرت کے بعض بنیادی قواعد اور حقائق کا ذکر کرتا ہے۔ مثلاً قرآن حکیم ہمیں بتاتا ہے کہ کس طرح سے تاریخِ عالَم میں پے در پے ایسے انسانوں کا ظہور ہوتا رہا جنھوں نے کہا کہ وہ خُدا کے رسول ہیں اور لوگوں کو یہ بتانے آئے ہیں کہ ان کا سچا معبود اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ہے جو اس کائنات کا خالق ہے۔ کس طرح سے رسولوں کی دعوت کو بعض لوگوں نے قبول کر لیا اور بعضوں نے قبول نہ کیا۔ کس طرح سے قبول کرنے والوں کے دل اطمینان اور مسرّت سے بھر گئے' یہاں تک کہ وہ خُدا کے لیے طرح طرح کی مصیبتیں اور ذِلتیں اٹھانے بلکہ

مرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ کس طرح سے انکار کرنے والوں کو تباہی اور بربادی کا سامنا کرنا پڑا' یہاں تک کہ وہ نیست و نابود ہو گئے۔ کس طرح سے خدا کی محبّت یا دین انسان کی فطرت میں ہے جو لازوال اور غیر مبدل ہے۔ کس طرح سے خُدا کی عبادت انسان کے دل کو مطمئن کرتی ہے۔ کس طرح سے نوعِ انسانی اپنی فطرت کے اصلی تقاضوں کو بھولنے اور مختلف قسم کے غلط اور جھوٹے معبودوں کو اپنانے کی وجہ سے ٹکڑوں میں بٹ گئی ہے اور کس طرح سے ان کے اتحاد کی صرف یہی ایک صورت ہے کہ وہ اپنے سچّے معبود کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں۔ کس طرح سے انسان کے دل میں نیک و بد' درست اور نادرست اور خوب و زشت کو پرکھنے کا ایک معیار موجود ہے جو' خواہ انسان اس سے گریز کے بہانے بناتا رہے' ہر وقت اپنا کام کرتا رہتا ہے۔ پھر انسانی لاشعور کے بعض ایسے وظائف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جن کو ماہرین نفسیات نے حال ہی میں سمجھا ہے قرآن حکیم ہمیں بتاتا ہے کہ کس طرح سے انسانی فرد کے چھوٹے اور بڑے اعمال اس کے وجود میں ایک نامۂ اعمال کی صورت میں محفوظ رہتے ہیں اور کس طرح سے یہ نامۂ اعمال موت کے بعد انسان کے سامنے کھل جائے گا اور وہ کہے گا کہ میرا کوئی چھوٹا یا بڑا فعل ایسا نہیں جو اس کے اندر لکھا نہ گیا ہو۔ وعلیٰ ھذا القیاس۔ اگر ہم ان حقائق کا پورا پورا تجزیہ کریں اور ان کے معانی و مطالب اور ان کے نتائج و مضمرات اور اسباب و عوامل پر پوری طرح سے حاوی ہو جائیں تو تمام انسانی اور نفسیاتی علوم (Human Sciences) اپنی پوری تفصیلات کے ساتھ وجود میں آ جاتے ہیں۔

گویا اگر ہم قرآن حکیم کے اس ارشاد پر کہ مظاہرِ قدرت پر پوری طرح سے غور و فکر کرو' عمل کریں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تمام سائنسی علوم آیات اللہ کے ایک سلسلہ کے طور پر وجود میں آ جاتے ہیں۔ مسلمانوں نے جو سائنسی طریق تحقیق ایجاد کیا تھا اور سائنسی علوم کی بنیاد رکھی تھی اس کی اصل قرآن کی یہی تعلیم ہے۔

منکرینِ خُدا کا مشاہدہ و مطالعۂ کائنات

شاید یہاں یہ سوال کیا جائے گا کہ اگر مظاہرِ قدرت آیاتُ اللہ ہیں تو کافر یا دہریہ قسم کے سائنسدان جو مظاہرِ قدرت کا مشاہدہ و مطالعہ کرتے ہیں خُدا پر ایمان کیوں نہیں لے آتے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک منکرِ خُدا کا دل غیر اللہ کی محبّت سے معمور ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ مظاہرِ قدرت کو اس غلط محبّت کی روشنی میں دیکھتا ہے اور ان کو اپنے غلط معبود کے ساتھ متعلق کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ چونکہ اس کا تصوّرِ حقیقت غلط ہوتا ہے تو وہ مظاہرِ قدرت کو دیکھ کر ان سے صحیح نتائج اخذ نہیں کر سکتا۔ ظاہر ہے کہ اگر مظاہرِ قدرت آیاتُ اللہ یعنی خُدا کی ہستی اور اُس کی صفات' خالقیت و ربوبیت پر دلالت کرنے والے نشانات ہیں تو ان کو آیاتُ اللہ کے طور پر یعنی خُدا کی خالقیت اور ربوبیت کے عقیدہ کی روشنی میں ہی ٹھیک طرح سے سمجھا جا سکتا ہے۔ اگر ہم ان کے مشاہدہ اور مطالعہ کو خُدا کے عقیدہ سے الگ کر دیں تو ان کو ٹھیک طرح سے نہیں سمجھ سکیں گے' کیونکہ اس صورت میں ہم ان کو کسی اور قائم مقام عقیدہ کی روشنی میں یعنی کسی جھوٹے خُدا کے عقیدہ کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ مثلاً مادّہ کو ہی ایک قادرِ مطلق' خالق اور رب سمجھ لیں گے' اور چونکہ یہ عقیدہ غلط ہو گا وہ ہماری غلط راہ نمائی کرے گا اور ان کے مشاہدہ اور مطالعہ سے ہم جن نتائج تک پہنچیں گے وہ غلط یا ناتمام اور ناقص ہوں گے۔

آنکھوں کی بینائی اور دل کا اندھا پن

قرآن کی رُو سے خُدا کائنات کا نور ہے ﴿اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ﴾ (النّور: ۳۵) اور اس نور سے کائنات کا ایک ایک ذرّہ روشن ہے۔ اگر ہم اس نور کے بغیر کائنات کو سمجھنے کی کوشش کریں گے تو ہمارا حال ایسا ہی ہوگا جیسے کوئی شخص رات کے وقت کسی کمرہ کے برقی قمقمے کو بجھا کر گھٹا ٹوپ اندھیرے میں چیزوں کو ٹٹولتا پھرے۔ ایک مؤمن کو مظاہر قدرت میں تخلیق، تربیت، تحفظ، تحسین، تجمیل، تنظیم، رحمت، عدل، حکمت، علم، قدرت، زندگی اور بصارت وسماعت کے آثار آشکار نظر آتے ہیں۔ اس لیے اس کا یہ یقین اور محکم ہو جاتا ہے کہ اس کائنات کا کوئی خالق ہے جو رب، رحیم، قدیر، حفیظ، جمیل، حکیم، علیم، قدیر، سمیع وبصیر اور حیّ وقیوم ہے۔ اور اسے یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے کہ کوئی منکر خُدا یہ کہے کہ کائنات میں تخلیق تو موجود ہے لیکن کوئی خالق نہیں، ربوبیت تو موجود ہے لیکن کوئی رب نہیں، تحفظ موجود ہے لیکن کوئی حفیظ نہیں، جمال موجود ہے لیکن کوئی جمیل نہیں۔ اور رحمت، عدل، حکمت، علم، قدرت، زندگی، بصارت اور سماعت تو موجود ہیں، لیکن کوئی رحیم یا عادل یا حکیم یا علیم یا قدیر یا سمیع وبصیر اور حی وقیوم نہیں۔ لیکن یہ بات منکرِ خدا کے بس کی نہیں کہ اس کو کائنات میں نہ خُدا کی صفات نظر آسکتی ہیں اور نہ خُدا۔ کیونکہ اس کے دل کی فطری محبّت جو سچّے خدا کے لیے پیدا کی گئی تھی کسی اور جھوٹے خُدا کے لیے مصروفِ کار ہے، لہٰذا سچّے خُدا کے لیے مہیّا نہیں ہوسکتی۔ وہ حقائق کی غلط ترجمانی کرتا ہے، کیونکہ اس کی آنکھیں تو دیکھتی ہیں لیکن دل نہیں دیکھتا۔ اسی حالت کے متعلق قرآن حکیم نے فرمایا ہے کہ جو لوگ مظاہر قدرت کا مشاہدہ ومطالعہ کرنے کے بعد بھی غلط نتائج پر پہنچتے ہیں ان کی آنکھیں تو اپنا کام کرتی ہیں لیکن ان کے دل نہیں دیکھتے۔

﴿فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِیْ فِی الصُّدُوْرِ ﴿۴۶﴾﴾ (الحج)

''آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں (وہ سب کچھ دیکھتی ہیں) لیکن دل جو سینوں میں ہیں اندھے ہو جاتے ہیں (کہ غلط سوچتے اور غلط مشاہدات سے غلط نتائج نکالتے ہیں)۔''

اقبال نے اسی مضمون کو ایک شعر میں ادا کیا ہے: ؎

دلِ بینا بھی کر خُدا سے طلب　　　آنکھ کا نور دل کا نور نہیں!

قرآن حکیم کی اس آیت میں اور اقبال کے اس شعر میں بھی ''دلِ بینا'' سے مراد ایسا دل ہے جس میں خُدا کی محبّت کا فطری جذبہ ابھی غیر اللہ کی محبّت کے لیے اس طرح سے صَرف نہ ہوا ہو کہ پھر خُدا کی محبّت کے لیے مہیّا نہ ہو سکے، یعنی جس میں غیر اللہ کی غیر فطری محبّت سے بے اطمینانی ابھی باقی ہو، جیسی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل کی بے اطمینانی تھی کہ وہ کسی ستارے، چاند یا سورج کو زیادہ دیر تک اپنا رب نہ مان سکے۔

انسان کی فطرت اس طرح سے بنائی گئی ہے کہ جہاں بھی، جس وقت بھی اور جس وقت تک بھی وہ سچّے خُدا کے عقیدہ سے الگ رہے اس کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ اس جگہ، اس وقت اور اس وقت تک وہ سچّے خُدا کے عقیدہ کے بجائے عملی طور پر کسی اور خُدا یعنی جھوٹے خُدا کے عقیدہ کو اختیار کرے اور اسی کو کائنات کا خالق، مالک اور ربّ سمجھے خواہ زبانی طور پر اس بات کا اعتراف کرے یا نہ کرے۔ (باقی صفحہ ۷۶ پر)

مباحثِ عقیدہ (۷و۸)

مؤمن محمود

آج اِن شاء اللہ توحید کے حوالے سے کچھ مزید بات ہوگی اور ہم دیکھیں گے کہ توحید کی حقیقت کیا ہے اور اس میں کچھ تصوّرات کی وجہ سے کیا خلل واقع ہو گیا ہے۔ اور یہ بھی جاننے کی کوشش کریں گے کہ مشرکینِ مکّہ کے ہاں کون سا شرک تھا اور وہ کس حد تک توحید کا اقرار کرتے تھے — توحید اور شرک کو سمجھنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم جانیں کہ مشرکینِ مکّہ کا شرک کیا تھا اور اللہ کے نبی ﷺ نے انہیں کس عقیدے سے روک کر کن معتقدات کی دعوت دی تھی۔ آج توحید کے حوالے سے گفتگو اس حیثیت سے کرنی ہے کہ فی زمانہ توحید کے حوالے سے کچھ تغیر واقع ہوا ہے اور کچھ نئے تصوّرات پیدا ہوئے ہیں تو ان تصوّرات کی حقیقت کیا ہے اور ان سے توحید یا اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے تعلق میں کچھ خلل واقع ہوا ہے یا نہیں اور کچھ ایسے نظریات و تصوّرات تو پیدا نہیں ہو گئے کہ جو توحید سے مناسبت نہیں رکھتے۔

بندے اور اللہ کا تعلق بے مثل ہے!

اس ضمن میں سب سے پہلے یہ جاننا چاہیے کہ بندے اور خدا کے درمیان جو عبودیت کا تعلق ہے اس کی کوئی مثل ہمارے ہاں نہیں ہے۔ یعنی جب ہم اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے اپنے تعلق کو بیان کریں گے تو ہم اس کی کوئی مثال دنیا میں سے نہیں دے سکتے۔ مثال کے طور پر ہم کہیں کہ ہمارا اللہ سے وہ تعلق ہے جو ایک محکوم کا حاکم سے ہوتا ہے۔ مگر ہم یہ مثال اس لیے نہیں دے سکتے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ہمیں عدم سے پیدا کیا ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہمارا خالق، ہمارا معبود اور ربّ ہے۔ تو یہ تعلق بندے کا اللہ کے سوا کسی اور سے نہیں پایا جاتا۔ چاہے کوئی شخص میرا حاکم ہو لیکن اس حاکم نے مجھے عدم سے پیدا نہیں کیا، وہ میرا خالق نہیں ہے، وہ میرا ربّ نہیں ہے۔ تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے جو بندے کا تعلق ہے اس کو علماء نے کہا: لا مثیل لہ کہ اس کی کوئی مثیل کسی اور تعلق میں نہیں پائی جاتی۔ فرد کا فرد سے تعلق یا فرد کا جماعت سے تعلق یا حاکم کا محکوم سے تعلق یا اولاد کا والدین سے تعلق یا شوہر کا بیوی یا بیوی کا شوہر سے تعلق، یہ جتنے بھی تعلقات ہیں اس میں کوئی بھی تعلق اللہ سبحانہ وتعالیٰ اور بندے کے تعلق کے مانند نہیں ہے۔ لہٰذا تشبیہ اور تمثیل دیتے ہوئے بہت احتیاط کی ضرورت ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم اللہ اور بندے کا تعلق کسی ایسے محدود تعلق کے اندر بند کر دیں کہ جس کے نتیجے میں بندے اور خدا کے درمیان تعلق کی اصل روح جاتی رہے۔

پہلی بات یہ تھی کہ عبودیت کا جو تعلق ہے اس کی کوئی مثیل نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں عدم سے پیدا کیا اور بس یہ اللہ کی شان ہے۔ اسی لیے آپ دیکھیے اللہ سبحانہ وتعالیٰ قرآن مجید میں جب بھی اپنی توحید پر استدلال

قائم کرتے ہیں تو عموماً وہ استدلال اللہ تعالیٰ اپنے ربّ یا خالق ہونے کے ناطے سے کرتے ہیں۔ اگرچہ ربّ کے اندر خالق کا مفہوم ہے لیکن ربّ کے اندر کچھ اضافی مفہوم بھی ہے۔ یعنی ربّ کے مفہوم میں پیدا کرنا بھی ہے اور پیدا کرنے کے بعد بقاء کا سامان فراہم کرنا بھی ہے اور اس شے کو اپنے کمال تک پہنچانا بھی ہے۔ تو ربّ کے اندر یہ تمام معنیٰ ہیں اور خالق کے اندر محض خلق کرنا ہے۔ تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ استدلال فرماتے ہیں کہ مَیں خالق ہوں اور مَیں ربّ ہوں، لہٰذا میری عبادت کرو۔ یہ استدلال قرآن مجید میں جابجا موجود ہے۔ مثال کے طور پر سورۃ البقرۃ میں جہاں دعوت کی ابتدا ہوئی تو فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝۲۱﴾

''اے لوگو! بندگی اختیار کرو اپنے اُس ربّ (مالک) کی جس نے تم کو پیدا کیا اور تم سے پہلے جتنے لوگ گزرے ہیں (انہیں بھی پیدا کیا) تاکہ تم بچ سکو۔''

دیکھیے دونوں صفات آ گئیں۔ اعْبُدُوْا رَبَّكُمْ کہ اپنے ربّ کی عبادت کرو۔ کون سا ربّ؟ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ کہ جس نے تمہیں پیدا کیا۔

پھر اللہ تعالیٰ اپنی ربوبیت کے مظاہر قرآن مجید میں جابجا بیان فرماتے ہیں کہ مَیں کس طریقے پر تمہاری تربیت فرما رہا ہوں، تمہیں تدریجاً کمال تک پہنچا رہا ہوں اور کس طریقے پر مَیں نے تم پر انعامات کیے ہیں:

﴿الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً ۠ وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۲۲﴾

''جس نے تمہارے لیے زمین کو فرش اور آسمان کو چھت بنا دیا، اور آسمان سے پانی برسایا پھر اُس (پانی) کے ذریعے سے (زمین سے) ہر طرح کی پیداوار نکال کر تمہارے لیے رزق بہم پہنچایا۔ تو ہرگز اللہ کے مدِمقابل نہ ٹھہراؤ جانتے، بوجھتے۔''

تو یہ پورا استدلال مکمل ہو گیا۔ یعنی اللہ ربّ ہے، اللہ خالق ہے، اللہ منعم ہے، لہٰذا اللہ کی عبادت ہونی چاہیے۔ جیسے ہمارے علماء نے کہا، اس استدلال کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ عبادت کے حوالے سے جو پہلا جذبہ انسان کے اندر پیدا ہوگا وہ شکر کا ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے سامنے وہ اپنی گردن جھکا دے اور محسوس کرے کہ وہ اللہ کے احسان کے بوجھ تلے دبا ہوا ہے کیونکہ اللہ نے اسے عدم سے پیدا کیا ہے۔ اس کی ایجاد، ابقاء اور امداد فرمائی اور اسے کمال تک پہنچایا۔

استدلال بر معبودیت

قرآن مجید میں آپ دیکھیں گے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے معبود ہونے پر جو استدلال ہے وہ اللہ کی ربوبیت، اللہ کی خالقیت، اللہ کی قیومیت اور انعاماتِ الٰہیہ کے ساتھ ہے۔ آپ دیکھیں وحی کی پہلی آیت جو نازل ہوئی اس میں ربّ اور خلق دونوں کو جمع کیا گیا: ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۝۱﴾ ''پڑھیے اپنے اُس ربّ کے نام سے جس نے پیدا کیا۔'' اسی طریقے پر آپ قرآن مجید دیکھتے چلے جائیے جہاں جہاں بھی اللہ اپنے انعامات بیان فرما رہا ہے

تو اپنے انعامات، ربوبیت اور خلق کے ذریعے اپنے الٰہ ہونے پر استدلال فرماتا ہے۔ اس کی وضاحت آگے آجائے گی۔ مثال کے طور پر وہ جو بڑی خوبصورت آیات ہیں سورۃ النمل کی: ﴿اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ ۚ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا ۗ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۗ﴾ (آیت: ۶۰) ''بھلا کون ہے جس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو اور آسمان سے تمہارے لیے پانی اتارا! پھر اس کے ذریعے سے ہم نے پُررونق باغات اُگائے۔ تمہارے لیے ممکن نہیں تھا کہ ان کے درختوں کو خود اُگا سکتے۔ کیا کوئی اور معبود بھی ہے اللہ کے ساتھ؟'' ﴿اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّجَعَلَ خِلٰلَهَآ اَنْهٰرًا وَّجَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا ۗ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۗ﴾ (آیت: ۶۱) ''بھلا کس نے بنایا زمین کو ٹھہرنے کی جگہ اور رواں کر دیے اس کے اندر دریا (اور ندیاں)، اور بنائے اس کے لیے لنگر (پہاڑ) اور بنایا دو دریاؤں کے درمیان پردہ؟ کیا کوئی اور معبود بھی ہے اللہ کے ساتھ؟'' ﴿اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ۗ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۗ﴾ (آیت: ۶۲) ''بھلا کون ہے جو سنتا ہے ایک مجبور و لاچار کو جب وہ اس کو پکارتا ہے اور (اُس کی) تکلیف کو دور کرتا ہے؟ اور جو تمہیں جانشین بناتا ہے زمین میں؟ کیا کوئی اور معبود بھی ہے اللہ کے ساتھ (ان کاموں میں شریک)؟'' ﴿اَمَّنْ يَّهْدِيْكُمْ فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَنْ يُّرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًا ۢ بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ۗ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۗ﴾ (آیت: ۶۳) ''بھلا کون ہے جو تمہیں راستہ دکھاتا ہے خشکی اور سمندر کے اندھیروں میں؟ اور کون بھیجتا ہے ہواؤں کو بشارت دیتی ہوئی اپنے بارانِ رحمت کے آگے آگے؟ کیا کوئی اور معبود بھی ہے اللہ کے ساتھ؟'' ﴿اَمَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَمَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۗ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۗ﴾ (آیت: ۶۴) ''بھلا کون ہے جو ابتدا میں پیدا کرتا ہے مخلوق کو، پھر اس کا اعادہ کرتا ہے؟ اور کون ہے جو تم لوگوں کو رزق دیتا ہے آسمانوں اور زمین سے؟ کیا کوئی اور معبود بھی ہے اللہ کے ساتھ؟''

آپ دیکھ رہے ہیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ خلق اور خلق کے بعد انسان اور جتنی بھی مخلوقات ہیں ان کی بقاء کا جو سامان اللہ نے مہیا فرمایا ہے، اس کے ذریعے اپنے معبود ہونے پر استدلال فرما رہے ہیں۔ اگر آپ اس نظر سے قرآن مجید پڑھیں گے تو آپ پر یہ بات واضح ہوتی چلی جائے گی کہ کس طریقے پر خلق اور ربوبیت اور قیومیت کے ذریعے اللہ سبحانہ وتعالیٰ استدلال فرماتے ہیں۔ ان استدلالات ہی سے یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ عبودیت کے حوالے سے انسان کے اندر جو جذبات پیدا ہوں گے وہ کس نوع کے ہوں گے۔ مثال کے طور پر اگر اللہ تعالیٰ مستقل استدلال فرماتے کہ میری عبادت اس لیے کرو کہ میں حاکم ہوں اور میرے حکم کے بغیر کچھ نہیں ہوتا۔ اگرچہ یہ حقیقت ہے اپنی ذات میں، اس کا انکار نہیں ہو رہا لیکن یہ بنائے استدلال نہیں ہے۔ اس سے ہمارے اندر حاکم اور محکوم کے تعلق والے جذبات پیدا ہوتے جو مختلف اور محدود ہیں ان سے کہ جو مخلوق، مربوب اور منعم علیہ ہونے کے نتیجے میں پیدا ہونے چاہئیں۔

احساساتِ عبودیت

علماء نے کہا اس کے نتیجے میں جو احساساتِ عبودیت پیدا ہوتے ہیں' ان میں سب سے پہلا احساس تو فقر کا ہے' یعنی اپنے کچھ نہ ہونے کا احساس' اپنے لاشیئ ہونے کا احساس' اپنے کالعدم ہونے کا احساس۔ گویا مَیں کچھ بھی نہیں ہوں اور جو کچھ ملا ہے خلق اور بقا' دونوں ہی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی دین اور عنایت ہیں۔ چنانچہ خلق اور بقاء جب اللہ کی طرف سے ہے اور مَیں اپنی ذات میں کالعدم ہوں تو بس مَیں اللہ کے سامنے اپنے آپ کو فقیر محسوس کرتا ہوں۔ مَیں کچھ بھی نہیں ہوں' میرے پاس اپنا ذاتی کچھ ہے ہی نہیں۔ یعنی مَیں کس بات پہ فخر کروں؟ جو بھی ملا ہے اللہ کی طرف سے ملا ہے۔ اللہ ربّ العزت نے فرمایا:

﴿وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ثُمَّ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَاِلَيْهِ تَجْـَٔرُوْنَ ﴿۵۳﴾﴾ (النحل)

''اور جو نعمت بھی تمہیں میسّر ہے وہ اللہ ہی کی طرف سے ہے' پھر جب تمہیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اسی کے سامنے تم فریاد کرتے ہو۔''

اس احساسِ فقر کے بعد مَیں دیکھتا ہوں کہ مجھے ملا تو بہت کچھ ہے مگر سب اللہ نے دیا ہے۔ منعم حقیقی کی پہچان سے شکر کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ عبودیت کا سفر گویا فقر سے شروع ہوتا ہے' شکر سے گزرتا ہے۔ اللہ کا احسان مند ہونا' اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی نعمتوں کے بوجھ تلے اپنے آپ کو دبا ہوا محسوس کرنا اور پھر جو منعم حقیقی ہے اس سے ٹوٹ کر محبت کرنا۔ یہاں سے جو عبودیت کی جڑ ہے یا روح ہے جس کے بغیر عبودیت بالکل خشک ہے بلکہ عبودیت نہیں ہے محض اطاعت ہے' وہ روح پیدا ہوتی ہے جس کو ہم محبت کہتے ہیں۔ یعنی فقر ہے' پھر شکر کا احساس ہے اور پھر منعم سے ٹوٹ کر محبت کرنا ہے۔ اور جب منعم سے ٹوٹ کر محبت کی جائے گی تو پھر منعم کی اطاعت کرنا اس کے سامنے جھک جانا' خضوع کا مظاہرہ کرنا' تضرع کا مظاہرہ کرنا' یہ عبودیت کے مراحل ہیں۔ گویا فقر ہے' شکر ہے' غایت درجہ کی محبت ہے' غایت درجہ کا تضرع ہے' غایت درجہ کا اللہ کے سامنے جھک جانا ہے' غایت درجہ کی اطاعت اختیار کرنا ہے اور اللہ پر نچھاور ہو جانا اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے لیے اپنے آپ کو فنا کر دینا' اور اللہ کے لیے اپنے آپ کو قربان کر دینے کے جذبات اپنے دل میں موجزن پانا۔ یہ عبودیت ہے۔ اب جب یہ عبودیت پیدا ہوتی ہے اللہ کو خالق' ربّ' قیوم اور منعم ماننے کے بعد پھر کچھ اعمالِ قلبیہ پیدا ہوتے ہیں اور اصل عبودیت ان اعمالِ قلبیہ کا نام ہے۔ جیسے ابن تیمیہ علیہ الرحمہ کا ایک مشہور قول ہے کہ العبودیۃ عبودیۃ القلب والحریۃ حریۃ القلب کہ غلامی دل کی غلامی ہے اور آزادی دل کی آزادی ہے۔

شکر' اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے محبت اور اللہ کے سامنے اپنے آپ کو لاشئ محسوس کرنے سے جو عبودیت پیدا ہوگی وہ غایت درجہ کی محبت ہے جو دل میں ہے۔ وہ غایت درجہ کا خوف بھی ہے کہ یہ جو میرا مالک ہے جس نے مجھ پر انعامات کیے ہیں' جس نے مجھے عدم سے پیدا کیا' مجھ سے کچھ چاہتا بھی ہے اور اگر مَیں نے وہ نہ کیا جو وہ مجھ سے چاہتا ہے تو پھر وہ مجھ سے ناراض ہوگا۔ غایت درجہ کی تواضع ہے' غایت درجہ کی رجا ہے' اللہ سے امید ہے' اللہ پر توکّل ہے اور یہ توحید کی بنیاد ہے۔

توکّل ثمرۂ توحید ہے

اگر آپ امام غزالی علیہ الرحمہ کی احیاء العلوم پڑھیں تو انہوں نے جہاں توکّل کا بیان کرنا تھا وہاں پہلے توحید کا بیان کیا‘ کیونکہ وہ بتانا یہ چاہ رہے تھے کہ توکّل توحید کا سب سے بڑا ثمرہ ہے۔ یعنی اگر آپ نے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی توحید کا اقرار کیا ہے اور اللہ کو خالق کل مانا ہے اور اللہ کے سوا سب کو بے بس اور لاچار مانا ہے تو اس کے بعد جو حال آپ کا پیدا ہونا چاہیے وہ حال توکّل ہے۔ گویا دل کی عبودیت توکّل ہے‘ کیونکہ توکّل ہمارے ہاتھ پاؤں پہ کہیں نظر نہیں آئے گا۔ توکّل دل میں ہوتا ہے‘ دل کی عبودیت محبت ہے‘ خوف ہے‘ رجا ہے‘ اللہ سے امید ہے‘ اللہ کا مستقل ذکر ہے‘ کیونکہ جب وہ آپ کا محبوب ہو گیا تو آپ کا دل اور آپ اس کی یاد میں مستقل رطب اللسان رہیں گے۔ تو یہ ذکر ہے‘ توکّل ہے‘ زہد ہے۔ زہد بھی اصلاً دل کی عبادت ہے۔ کیونکہ علماء نے کہا کہ زہد کا مطلب ہاتھ میں مال ہونا یا نہ ہونا نہیں ہے‘ بلکہ زہد کا مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے غیر سے دل اٹھ گیا ہے۔ یہ زہد ہے۔ اسی طریقے پر تبتّل ہے‘ اللہ کی طرف منقطع (یکسو) ہوتے چلے جانا۔ جیسے فرمایا:

﴿اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا ۝۷ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا ۝۸ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا ۝۹ وَاصْبِرْ عَلٰي مَا يَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا ۝۱۰﴾ (المزمل)

’’یقیناً دن کے اوقات میں تو آپؐ کے لیے بڑی مصروفیات ہیں۔ اور آپؐ اپنے ربّ کے نام کا ذکر کیا کریں اور ہر طرف سے کٹ کر بس اُسی کے ہو رہیں۔ وہ ربّ ہے مشرق کا بھی اور مغرب کا بھی اُس کے سوا کوئی معبود نہیں‘ بس آپ اسی کو بنا لیجیے اپنا کارساز۔ اور جو کچھ یہ لوگ کہہ رہے ہیں اس پر صبر کیجیے اور ان کو چھوڑ دیجیے بڑی خوبصورتی سے کنارہ کشی کرتے ہوئے۔‘‘

اس میں تبتّل بھی ہے اور توکّل بھی۔ اللہ کے لیے محبت ہے تو اللہ کے غیر سے‘ جو اللہ کا دشمن ہے‘ نفرت بھی ہوگی۔ اللہ کے غیر سے‘ اللہ کے دشمن سے‘ یا مشرکین سے یا اللہ کے اعداء سے دشمنی بھی ہوگی۔ تو یہ جتنے جذبات ہیں یہ عبودیت قلب ہے اور یہ عبودیت کی بنیاد ہے۔ یہاں بھی شرک ہو جائے تو وہ شرک ہی ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر محبت لے لیجیے‘ اگر محبت اللہ کے غیر سے‘ اللہ جتنی یا اللہ سے زیادہ ہو جائے تو یہ شرک ہے۔ اور یہ شرک اصغر نہیں ہے بلکہ شرک اکبر ہے۔ اس پر سب کا اتفاق ہے۔ یعنی اگر اللہ جیسی یا اللہ سے بڑھ کر محبت ہو گئی تو یہ وہ شرک ہے جو اللہ معاف نہیں کرتا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ ۚ﴾ (النساء:۴۸)

’’اور یقیناً اللہ اس بات کو ہرگز نہیں بخشے گا کہ اُس کے ساتھ شرک کیا جائے اور اس سے کم تر جو کچھ ہے وہ جس کے لیے چاہے گا بخش دے گا۔‘‘

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ۭ﴾ (البقرۃ:۱۶۵)

’’اور لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو اللہ کو چھوڑ کر کچھ اور چیزوں کو اُس کا ہمسر اور مدمقابل بنا دیتے ہیں‘ وہ

ان سے ایسی محبت کرنے لگتے ہیں جیسی اللہ سے کرنی چاہیے۔''

اور سورۃ التوبہ کی مشہور آیت ۲۴ میں آٹھ اشیاء بیان کر کے فرمایا:

﴿..... اَحَبَّ اِلَیۡکُمۡ مِّنَ اللّٰہِ وَ رَسُوۡلِہٖ وَ جِہَادٍ فِیۡ سَبِیۡلِہٖ فَتَرَبَّصُوۡا حَتّٰی یَاۡتِیَ اللّٰہُ بِاَمۡرِہٖ ؕ﴾

''(اگر یہ سب چیزیں) تمہیں محبوب تر ہیں اللہ' اُس کے رسول اور اُس کے راستے میں جہاد سے' تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ سنا دے۔''

اسی طریقے پر اللہ کے سوا اللہ کے غیر کا خوف بڑھ گیا تو شرک ہو جائے گا۔ اللہ کے سوا کسی اور پر اعتماد ہو گیا تو شرک ہو جائے گا۔ توکّل اللہ پر ہونا چاہیے' لہٰذا قرآن مجید میں جا بجا وَعَلَی اللّٰہِ فَلۡیَتَوَکَّلِ الۡمُتَوَکِّلُوۡنَ... الۡمُؤۡمِنُوۡنَ کے الفاظ آپ پاتے ہیں۔ یہ سارے جذبات اللہ کے لیے پیدا ہوں گے جو ذکر کر دیے گئے' محبت رجا' خوف توکّل' زہد' انابت اور ذکر اور ورع اور اللہ کی مخلوق کے لیے شفقت' نرمی کا برتاؤ اور تواضع۔

خلاصۂ دین

امام رازیؒ سے ایک دفعہ پوچھا گیا کہ دین کا خلاصہ بیان کیجیے۔ انہوں نے فرمایا: الدین ھو التعظیم لامر اللہ الشفقۃ علی خلق اللہ کہ دین اللہ کے حکم کی تعظیم ہے' اللہ کی مخلوق پر شفقت ہے۔ بس یہ دو چیزیں ہیں۔ جس کا حکم ہے اُس کی تعظیم ہے' اُس کی محبّت ہے۔ یہ سارے عبودیت کے جو مظاہر ہیں وہ سب اس میں آ گئے۔ عبودیتِ قلب کے بعد جو عبودیت ظاہر ہوتی ہے اس کو عبودیتِ جوارح کہتے ہیں۔ اس میں نماز ہے' روزہ ہے' حج ہے' زکاۃ ہے۔ اور باقی شریعت کے جتنے بھی اعمال ہیں جن کو ہم عبادات اور معاملات کہتے ہیں' مباحات بھی اس میں شامل ہیں' اگر ان کو نیت کے ذریعے عبادت بنا لیا جائے تو جتنے بھی اعمال ہمارے اَعضاء و جوارح سے ظاہر ہوں گے وہ سب بھی عبودیت کہلائیں گے' لیکن ان کا مرتبہ عبودیتِ قلب کے بعد ہے۔ اور اگر عبودیتِ قلب نہ ہو تو یہ سارے اعمال منافقانہ ہو جائیں گے۔ منافق وہ ہے جس کے دل میں عبودیت نہیں ہے لیکن جوارح میں بظاہر عبودیت نظر آ رہی ہے۔ تو یہ ایک منطقی ترتیب ہے جس کے ذریعے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی عبودیت پیدا ہونی چاہیے کہ اللہ خالق ہے' اللہ ربّ ہے' اللہ قیوم ہے' اللہ منعم ہے' لہٰذا میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ مَیں اللہ کے سامنے جھک جاؤں' شکر کے جذبات پیدا ہوں' اس سے ٹوٹ کر محبّت کروں' ٹوٹ کر اس کے سامنے تضرع اختیار کروں اور پھر اس کے نتیجے میں اعمالِ قلبیہ پیدا ہوں اور اس کے بعد اعمالِ جوارح پیدا ہوتے چلے جائیں۔ یہ مختصراً وضاحت کی کوشش کی ہے کہ عبادت کیا ہے۔

تحوّلِ عظیم

اس کے بعد اب جو اصل موضوع ہے کہ یہ جو بندے اور خدا کا تعلق ہے' عبد اور معبود کا جس کی بنیاد فقر' محبّت' تضرّع اور اللہ کے ربّ اور معبود ہونے اور خالق اور قیوم ہونے اور منعم ہونے کا اعتقاد اور یقین ہے' اس میں پچھلی صدی

کی ابتدا میں کچھ تبدیلی پیدا ہوئی۔ بتایا یہ گیا اور بتانے والے بڑے بڑے لوگ تھے جو بہت اللہ والے، مخلص اور اچھے لوگ تھے کہ اُمّت نے توحید کا مطلب ٹھیک نہیں سمجھا اور اُمّت ابتدائی دو تین صدیوں کے بعد توحید کا حقیقی مفہوم بھول گئی، یہاں تک کہ کچھ بنیادی اصطلاحات کا مفہوم بھی بدل گیا۔ مثال کے طور پر ایک بہت بڑے بزرگ تھے انہوں نے فرمایا کہ قرآن کی چار بنیادی اصطلاحات ہیں: دین، عبادت، الٰہ اور ربّ۔ یہ جو اصطلاحات ہیں پہلی دو ڈھائی صدیوں کے بعد ان کے مفاہیم غائب ہو گئے۔ اور جو مفاہیم پیدا ہوئے وہ بہت محدود بھی تھے اور حقیقی نہیں بلکہ ثانوی تھے۔ انہوں نے کہا کہ میں بتاؤں گا کہ ان کے حقیقی مفاہیم کیا ہیں کہ جس پر وقت کے ساتھ ساتھ ایک پردہ پڑتا چلا گیا۔ اور پھر انہوں نے دین، الٰہ، ربّ اور عبادت کے اپنے تئیں حقیقی مفاہیم بیان کیے۔ ان سب کا خلاصہ یہ ہے کہ ان سب میں جو حقیقی مفہوم غالب ہے وہ اللہ کے حاکم ہونے کا ہے۔ یعنی اللہ کی حاکمیت کا مفہوم جو اگرچہ برحق مفہوم ہے، لیکن اللہ کے خالق، ربّ، قیوم اور منعم ہونے کے تقاضوں میں سے ہے، اس کی اصل نہیں ہے۔ انہوں نے بتایا کہ نہیں، اصل خدا کا حاکم ہونا ہے! مصر میں بھی ایسے ہی بتایا گیا، ہندوستان میں بھی ایسے ہی بتایا گیا کہ ربّ کا اصل مفہوم تو حاکم ہونا ہے، الٰہ کا اصل مفہوم بھی حاکم ہونا ہے، جو قانون دینے والا ہے، law giver ہے، مقنن ہے۔ اصل مفہوم یہ ہے۔ اور پھر دین کا بھی یہی مفہوم ہے۔ یعنی جو تم نے دین کو سمجھ لیا کہ بندے اور خدا کا ایک بہت ذاتی تعلق اور محبّت، ان چیزوں کا انہوں نے انکار نہیں کیا۔ کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ اللہ سے محبّت نہیں ہونی چاہیے، لیکن ایک تحوّلِ عظیم ہوا جس میں توجّہ ان چیزوں کی بجائے کسی اور چیز پر ہو گئی۔ تو دین کی یہ تعریف ہمارے سامنے آئی کہ دین کہتے ہیں اللہ کو حاکم مان کر اُس کے نظام یا اُس کے قانون کی اتباع کرنا اور اس کے کچھ دلائل بیان کیے، جو اصلاً ٹھیک نہیں تھے۔

قرآن مجید میں دین اپنے لغوی مفہوم میں بھی آیا ہے تو لغوی مفاہیم کو جوڑ کر بتایا گیا کہ دین کا اصل مفہوم یہ ہے کہ کسی کو حاکم مان کر، کسی کو law giver یا مقنّن مان کر، کسی کو مشرع یا شارع مان کر اس کے احکام، قوانین اور نظام کی اتباع کرنا دین ہے۔ اور یہی اصل توحید ہے۔ اور اصل جو خلل پیدا ہوا وہ یہ ہے کہ یہ جو توحید ہے یہ مسلمانوں کی نگاہوں سے اوجھل ہوتی چلی گئی اور دین کے اصل مفاہیم ذہنوں سے غائب ہوتے چلے گئے۔ یہ ایک تصوّر ہے جو پیدا ہوا کہ جس میں اصل تعلق بندے کا اور خدا کا حاکم اور محکوم ہونا قرار پایا۔ اس میں یہ ذہن میں رکھیے گا کہ ہم بالکل انکار نہیں کر رہے کہ انہوں نے محبّت، توکّل، خوف اور رجا کی بات نہیں کی۔ اس میں تو کوئی شک نہیں ہے کہ یہ دین کے احوال ہیں اور جو بھی قرآن مجید پڑھے گا اس پر واضح ہو جائے گا کہ یہ بھی مقصود ہیں۔ لیکن ہوتا کیا ہے کہ جب آپ کسی شے کی کوئی تعریف مقرر کرتے ہیں اور کسی شے کو اصل اور دوسرے کو ثانوی قرار دیتے ہیں تو ایک shift of emphasis پیدا ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے کچھ چیزوں پر توجّہ بڑھتی چلی جاتی ہے اور کچھ چیزوں پر توجّہ کم ہوتی چلی جاتی ہے جس کے پھر کچھ مظاہر پیدا ہوتے ہیں۔ جیسے کہ اللہ کے ساتھ وہ تعلق جس کی تفصیل مَیں نے بیان کی، اس کے نتیجے میں ایک خاص دینی نفسیات پیدا ہو گی۔ یہاں حاکم اور محکوم کا تعلق جب بیان کیا جائے گا تو اس کے نتیجے میں بھی ایک خاص قسم کی دینی نفسیات پیدا ہو گی اور ہم نے دیکھا کہ وہ نفسیات پیدا ہوئی۔ ہم نے جب

خالق اور مخلوق‘ عابد اور معبود کا تعلق دیکھا تو اس میں اصل بنیاد محبّت‘ احساسِ فقر اور شکر پر استوار تھی اور یہ سارے جذبات عبودیت کی اصل قرار پاتے تھے۔ جب حاکم اور محکوم کا تعلق اصل بن گیا تو اس کے نتیجے میں اطاعت اصل قرار پائے گی۔ اطاعت دین کا مقصود ہے‘ لیکن چونکہ حاکم اور محکوم میں اصل تعلق محبّت کا نہیں ہوتا‘ بلکہ حاکم کی اطاعت ہوتی ہے اور محکوم اس کی اطاعت کرتا ہے‘ اس کے فرامین نافذ کرتا ہے۔ اس کا ایک نظام ہوتا ہے‘ وہ قانون دیتا ہے اور قانون پر عمل محکوم نے کرنا ہے۔ گویا عبودیت کی جو روح تھی اس روح کی جگہ یہ روح آ گئی اور جو وہ روح تھی وہ ثانوی ہو گئی۔ یعنی موجود رہی لیکن دین کے وسط میں نہ رہی۔ تو یہ ایک نئی قسم کی نفسیات پیدا ہوئی جس کے کچھ نتائج ہیں۔ کیونکہ جب آپ نے روح کو اور دین کی اصل کو ثانوی بنا دیا اور ثانوی شے کو اصل شے بنا دیا تو جو شے اپنی ذات میں مقصود تھی دین میں وہ مقصود لغیرہ قرار پائی۔ وہ کسی اور بڑے مقصد کے لیے ذریعہ ہو گئی۔ اور جو شے مقصود لغیرہ تھی یعنی اپنی ذات میں مقصود نہیں تھی کسی اور بڑے مقصود کے لیے ذریعہ تھی وہ مقصود لذاتہٖ ہو گئی۔ یعنی آپ کہیں کہ یہ معاملات الٹ ہو گئے۔ جو شے اوپر تھی وہ نیچے آ گئی اور جو شے نیچے تھی وہ اوپر چلی گئی۔ کچھ تعریفات بدل گئیں‘ تعبیر کا ایک نیا نظام تشکیل دیا گیا۔ تو ایسا ہوا کہ نماز بھی فی نفسہٖ مقصود نہیں رہی بلکہ ایسے ایسے اقوال پائے جاتے ہیں جس میں نماز بھی اصلاً ڈسپلن اور اجتماعیت پیدا کرنے کے لیے‘ امیر کی اطاعت کا خوگر بنانے کے لیے ہے وغیرہ وغیرہ۔ جو اصلاً نماز کی روح تھی کہ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکۡرِیۡ نماز اپنی ذات میں مقصود تھی اور اللہ کا ذکر سب سے بڑھ کر مقصود تھا تو وہ حاشیہ پر چلا گیا اور کچھ ایسے فوائد اس کے سامنے آنا شروع ہو گئے جو اصلاً حاکم اور محکوم کے تصوّر سے پیدا ہونے والی انفرادیت اور اجتماعیت میں کھپ سکیں۔ چنانچہ ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ ’’اسلام کی نشأۃِ ثانیہ‘‘ میں لکھتے ہیں کہ ایسے تصوّرات پیدا ہوتے چلے گئے کہ جو نماز اپنی ذات میں مقصود تھی اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے تعلق کا ذریعہ تھی‘ وہ ان تصوّرات کی وجہ سے بس اب ایک ایسی شے بن کر رہ گئی کہ جس میں وہ خود مقصود نہیں رہی بلکہ ایک اجتماعی نظام یا اس کے لیے ایک جماعت تشکیل دینے میں مدد و معاون ہوتی چلی گئی۔

عبادات فی نفسہٖ مقصود ہیں

ہمارے دین میں عبادات فی نفسہٖ مقصود ہیں۔ اب وہ فی نفسہٖ والا پہلو غائب ہوتا چلا گیا۔ ریاست‘ سیاست اور نظام مقصود تھا لیکن مقصود لغیرہٖ تھا‘ اب چونکہ وہ مقصود لذاتہٖ ہوتا چلا گیا تو جو مقصود لذاتہٖ اشیاء تھیں وہ اس میں مدد و معاون بنتی چلی گئیں۔ تو یہ ایک بڑی اور بنیادی تبدیلی ہوئی جس کی وجہ سے کئی دفعہ آپ کو اس طرح کے جملے بھی سننے کو مل جاتے ہیں کہ وہ تو بس نماز روزے میں مشغول ہیں‘ یعنی نماز روزہ اصلاً کوئی شے نہیں ہے‘ یہ تو نماز روزہ میں بند ہیں‘ ان کا تو نماز روزہ کا دین ہے۔ حالانکہ ہمیں بتایا گیا ہے کہ دین کی افضل ترین عبادت نماز ہے۔ اس سے بڑھ کر کوئی شے نہیں‘ اس سے بڑھ کر کوئی عبادت نہیں۔ فرمایا: ((اِنَّ اَفۡضَلَ اَعۡمَالِکُمۡ عِنۡدَ اللّٰہِ الصَّلَاۃِ)) (سنن ابن ماجہ) اور اللہ کے نبی ﷺ کی آخری وصیتوں میں کیا تھا: ((اَلصَّلَاۃَ‘ اَلصَّلَاۃَ وَمَا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُکُمۡ)) (ابن ماجہ و ابوداؤد) دیکھو نماز‘ نماز اور اپنے ملک یمین کا خیال رکھنا‘ اپنے غلاموں سے اچھا برتاؤ رکھنا۔ اسی لیے آپ

دیکھیں گے کہ یہ سب تصورِ توحید میں خلل کی وجہ سے ہے۔ یعنی توحید میں بس ایک چیز آ گئی کہ ربّ کا اصل مفہوم حاکم کا ہے‘ الٰہ کا اصل مفہوم حاکم کا ہے۔ دین کا اصل مفہوم حاکم کی اطاعت کرنے کا ہے۔ تو انفرادی عبادت‘ ذکر اذکار اور تزکیہ کی اہمیت کم ہوتی چلی گئی اور اس کو کئی دفعہ حقارت کی نگاہ سے بھی دیکھا جانے لگا اور کہا گیا کہ یہ اپنے ہی گنبد میں بند ہیں۔ تو گویا انفرادی عبادت اور اللہ کے قریب ہونے کا جذبہ یہ اتنی اہم بات نہیں ہے۔ ہاں خارج میں حرکت اصل مقصود ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر جو دین کے مقاصد میں سے ہیں وہ ایک خاص نفسیات کے ساتھ زیادہ اہم ہو گئے۔ وہ خاص نفسیات یہ ہے کہ چونکہ حاکم اور محکوم کے تعلق میں کچھ لوگ حاکم کے خدائی فوجدار بھی ہوتے ہیں‘ یعنی وہ اس کے کارندے ہوتے ہیں‘ وہ اس کی پولیس ہیں۔ تو کئی دفعہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر جو نہایت تواضع اور شفقت اور سر جھکا کر کرنے کی شے تھی اس کے اندر ایک نیا جذبہ پیدا ہوا کہ ہم نے ڈنڈوں کے زور پر لوگوں سے کام نکلوانے ہیں اور لوگوں پر ایک شے نافذ کرنی ہے۔ ہم خدائی فوجدار ہیں۔ ہمیں خدا کی طرف سے یہ اختیار حاصل ہے‘ ہم اچھے ہیں دوسرے برے ہیں۔ اس طرح کے جذبات پیدا ہونے شروع ہوئے۔ باقی جو دینی تعلیم و تعلّم کا کام کر رہے ہیں اور تزکیہ میں مصروف ہیں‘ لوگوں کی اصلاح کر رہے ہیں‘ وہ اصل کام نہیں کر رہے۔

تکفیری فکر

پھر اسی تصوّر سے آپ دیکھیں کہ تکفیری سوچ پیدا ہوئی‘ یعنی مسلمانوں کے معاشروں کو اور مسلمانوں کی اکثریت کو کافر قرار دینا۔ مصر میں تو یہ بہت زیادہ ہوا‘ ہندوستان میں کم ہوا۔ مصر میں تو ۵۰ اور ۶۰ء کی دہائی میں یہ کام ہو رہا تھا جب سید قطب علیہ الرحمہ کی تحریریں بہت زیادہ پھیل رہی تھیں اور اس کے نتیجے میں ایک تصوّر پیدا ہو رہا تھا کہ یہ سارے معاشرے جاہلی معاشرے ہیں اور جو مسلمان ہیں وہ بھی نام کے مسلمان ہیں‘ وہ اصلاً مسلمان نہیں رہے۔ اگرچہ صراحتاً یہ مسلمانوں کی تکفیر نہیں تھی۔ مسلمان اس لیے نہیں رہے کہ توحید کے اس خاص تصوّر کو تو یہ مسلمان چھوڑ چکے ہیں۔ دین کی اصل اصطلاحات اور اصل معانی انہیں معلوم ہی نہیں ہیں‘ لہٰذا یہ تو حقیقتاً مسلمان نہیں ہیں۔ وہاں انہوں نے صراحتاً کافر نہیں کہا‘ لیکن بعد میں جب اس فکر میں مزید ترقی ہوئی تو پھر وہیں سے ’’التکفیر والھجرۃ‘‘ جیسے گروہ برآمد ہونا شروع ہو گئے جنہوں نے اس بات کو اپنے منطقی نتیجہ تک پہنچا دیا کہ یہ لوگ اصلاً مسلمان نہیں ہیں‘ مسلمانوں کی اکثریت مسلمان نہیں ہے‘ بلکہ یہ حقیقی ایمان سے ہاتھ دھو چکے ہیں۔ بس نام کے مسلمان ہیں‘ پیدائشی مسلمان ہیں اور توحید کا انہیں کچھ پتا نہیں ہے۔ اس طرح تکفیری فکر پیدا ہونا شروع ہو گئی۔ یہ سب ایک خاص تصوّر کے تحت ظہور پذیر ہوا۔ اس میں اگرچہ بہت سے اور عوامل بھی ہیں اور ان عوامل کا بھی تعلق ہے لیکن یہاں مَیں صرف توحید کے ضمن میں بیان کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ یہ تکفیری مزاج پیدا ہونا شروع ہوا اور اس مزاج میں سختی آئی۔ پھر یہ ہوا کہ جو دین کے غلبہ کا تصوّر ہے اس کے اندر بھی ایک محدودیت پیدا ہونا شروع ہو گئی۔ چونکہ اللہ سے تعلق اصلاً حاکم اور محکوم کا تعلق قرار پایا تو پھر دین کا غلبہ بھی محض سیاسی قرار دے دیا گیا‘ یعنی دین کے غلبے کی جدّوجُہد وہی کر رہا ہے جو دین کے سیاسی غلبہ کی کوشش کر رہا ہے۔

محدودیتِ تصوّرِ غلبۂ دین نتیجہ ہے توحید کے محدود تصوّر کا

غلبۂ دین کے تصوّر کی محدودیت میں اس توحید کے تصوّر کی محدودیت کا دخل ہے۔ غلبۂ دین تو بہت وسیع شے ہے‘ کسی بھی شعبہ میں غلبۂ دین کی کوشش ہوسکتی ہے‘ مگر ہوا یہ کہ جو لوگ تعلیم و تعلم میں ہیں اور وہ علمِ دین کو پھیلانے اور اس کے احیاء کرنے کی کوشش میں ہیں‘ یا صحیح علم دے رہے ہیں تو یقیناً یہ کام بھی غلبہ دین کی جِدّوجُہد قرار دینی چاہیے‘ لیکن جنہوں نے سیاسی غلبہ کو اصل دین قرار دیا تھا انہوں نے کہا کہ نہیں جب تک سیاسی غلبہ کی کوشش نہیں ہوگی یہ غلبہ دین کی جدّوجُہد نہیں ہے۔ کوئی شخص لوگوں کی اصلاح‘ تزکیہ اور احسان کی سطح پر کرنے کی کوشش کر رہا ہے تو یقیناً یہ بھی ایکشعبہ میں دین کا غلبہ ہے۔ اس وجہ سے کچھ تصوّرات میں محدودیت پیدا ہونی شروع ہوگئی اور غلبۂ دین کا تصوّر بھی محدود ہوگیا۔ اور محدود اس اعتبار سے ہوگیا کہ یہ سمجھا گیا کہ جب تک خالص سیاسی سطح پر دین کے غلبہ کو اصل مقصد قرار دے کر اس کے لیے کوشش نہیں ہوگی‘ اُس وقت تک کوئی بھی کوشش غلبہ کی کوشش نہیں ہوگی۔ سیاسی سطح پر غلبہ کے لیے یقیناً کچھ لوگوں نے محنت کرنی ہے اور کرتے رہیں گے‘ اور کرنی چاہیے‘ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جو کسی اور شعبہ میں دین کے غلبے کی کوشش کر رہا ہے تو اس کو کہا جائے کہ تم دین کا کام نہیں کر رہے۔ یہ بھی ایک مسئلہ اس میں پیدا ہوا کہ تعلیم و تعلم اور تزکیہ و احسان کے کاموں میں جو لوگ مصروف تھے ان کو ڈی گریڈ کیا گیا کہ نہیں یہ اصل کام نہیں ہے‘ بلکہ اصل کام کچھ اور ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ علم دین کے احیاء کے بغیر دین کا احیاء بھی نہیں ہوسکتا۔ اسی لیے حدیث میں‘ اگرچہ وہ سند کے اعتبار سے ضعیف ہے‘ فرمایا گیا: ((مَنْ طَلَبَ الْعِلْمَ لِيُحْيِيَ بِهِ الْاِسْلَامَ....)) (طبرانی) تو گویا علم کے ذریعے بھی اسلام کا احیاء ہوسکتا ہے‘ صحیح تصوّرات کو پھیلایا جاسکتا ہے‘ باطل تصوّرات کا رد ہوسکتا ہے۔ یہ سب بھی غلبہ دین کی ضروریات میں سے ہیں۔ پھر اس کی وجہ سے یہ ہوا کہ جو لوگ اور شعبوں میں کام کر رہے ہیں ان کے متعلق ایک سوءِ ظن پیدا ہوگیا۔ یعنی جو تعلیم و تعلم میں لگا ہے تو اس کے بارے میں دو ہی آپشن رہ گئیں‘ یا تو اس پر حقیقت واضح نہیں ہوئی یا یہ نیت کا فساد ہے۔ تیسری کوئی آپشن نہیں رہی۔ یعنی یا تو اس کو پتا نہیں ہے کہ دین کا صحیح تصوّر کیا ہے‘ یا پتا تو ہے لیکن اس کے اپنے کچھ منافع ہیں‘ کچھ مصلحتیں ہیں۔ باقی کوئی تیسری آپشن بھی ہوسکتی تھی اور یہی حسن ظن کا تقاضا ہے کہ اس کا تصوّر بھی ٹھیک ہے‘ اس کو پتا بھی ہے‘ اور اس کی نیت بھی ٹھیک ہے لیکن وہ دین ہی کے کسی اور محور میں محنت کر رہا ہے۔ یہ گنجائش رکھنی چاہیے تھی‘ لیکن یہ گنجائش نہیں رکھی گئی۔ یقیناً اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی حاکمیت میں کوئی شک نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کائنات کے حاکم ہیں‘ کیونکہ جو ربّ ہوگا وہ حاکم بھی ہوگا‘ لیکن یہ نہیں ہے کہ ربّ میں حاکم ہونا غالب ہے‘ بلکہ ربّ میں ربوبیت غالب ہے اور حاکم ہونا اس کا تقاضا ہے‘ اس کے اصل meanings میں سے نہیں ہے۔ تو بسا اوقات ایسا ہوجاتا ہے کہ تقاضا اگر اصل قرار دے دیا جائے تو اس کے نتیجے میں مفاہیم میں خلط مبحث واقع ہوجاتا ہے۔ اس لیے اس کی وضاحت ضروری تھی جو کر دی گئی۔

اقسامِ توحید (امام غزالیؒ)

امام غزالی علیہ الرحمہ نے ''احیاء علوم الدین'' میں توحید کی چار اقسام بیان کی ہیں۔ اور اس پر بہت سے لوگوں کا اعتراض بھی ہے کہ امام غزالیؒ نے جو اصل توحید ''لا الٰہ الا اللہ'' ہے اس کو تو ایک ہلکا درجہ دیا اور اس کے بعد اس کے کچھ ایسے مفاہیم بیان کیے جو اُن کے خیال میں توحید کے اعلیٰ مقام ہیں۔ وہ کہتے ہیں توحید کے چار درجات ہیں۔ پہلا درجہ یہ ہے کہ لا الٰہ الا اللہ صرف کہا جائے' دل میں یقین نہ ہو۔ یہ تو قیامت کے دن نفع نہیں دے گا۔ اور یہ تو منافقین بھی کہتے تھے' یعنی لا الٰہ الا اللہ صرف منہ سے کہنا بدون الایمان' ایمان کے بغیر۔ لا الٰہ الا اللہ توحید کا اقرار تو ہے لیکن اقرارٌ باللسان ہے' اقرارٌ بالقلب نہیں ہے۔ تو اقرار بالقلب ضروری ہے۔ پھر فرماتے ہیں کہ توحید کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ اللہ کی توحید کا اقرار کرے قلب کے اقرار کے ساتھ کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ معبود برحق ہے اور میں دل سے بھی مانتا ہوں۔ یہ توحیدِ عوام ہے۔ اس پر لوگوں کو اشکال ہوا کہ یہی تو اصل توحید ہے جبکہ امام غزالیؒ اسے توحیدِ عوام قرار دیتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اصل میں وہ یہ نہیں کہنا چاہ رہے کہ یہ توحیدِ عوام ہے بلکہ عوام اس سے جو ایک خاص درجے کا مفہوم لے رہے ہیں وہ درجہ بس عوام تک کے لیول کا ہے۔ جو آگے وہ معانی بیان کرنے جا رہے ہیں وہ بھی لا الٰہ الا اللہ ہی کے ہیں لیکن وہ توحید کا ایک اعلیٰ درجہ ہے۔ چنانچہ تیسرا درجہ یہ ہے کہ واقعی انسان دیکھ لے' یعنی اب یہ لا الٰہ الا اللہ اس کا اقرار نہ رہ جائے بلکہ اس کا مشاہدہ بن جائے کہ کائنات میں ہر شے چاہے وہ ایمان ہے' کفر ہے' اجسام ہیں' ارواح ہیں' جو بھی شے ہے اس کائنات میں وہ اللہ کے ارادے کے تابع ہے اور اللہ کی مشیت سے صادر ہو رہی ہے' یہ اس کا تقریباً عین الیقین بن جائے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اس درجے تک جب تک انسان نہیں پہنچتا' توکّل پیدا نہیں ہوگا۔ توکّل اسی وقت پیدا ہوگا جب واقعی یہ بات حال بن جائے اور مجھے یقین کامل حاصل ہو جائے کہ کائنات میں ایک مشیت کارفرما ہے اور وہ مشیت اللہ کی مشیت کے سوا کسی کی نہیں ہے۔

پھر انہوں نے ایک چوتھا درجہ بیان کیا اور وہ کہتے ہیں کہ یہ بس بیان کرنے کا ہے' اس کا حاصل ہونا بھی بالکل ضروری نہیں ہے اور یہ کبھی کبھار حاصل ہو بھی سکتا ہے' وہ فنافی التوحید کا درجہ ہے جو عموماً صوفیاء کے ہاں رہا کہ بندہ ایسا فنا ہو جائے کہ اللہ کے سوا کسی اور کا اُسے مشاہدہ نہ ہو' اللہ کے سوا وہ کسی اور کو نہ دیکھے اور ہر شے کو اللہ میں گھرا ہوا دیکھے۔ اس سے مراد کوئی وجودی طور پر گھرا ہوا نہیں' بلکہ جیسے سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مَا رَاَیْتُ شَیْئًا اِلَّا وَرَاَیْتُ اللّٰہَ قَبْلَہٗ ''میں کوئی شے نہیں دیکھتا مگر اللہ مجھے پہلے نظر آتا ہے''۔ وَمَا رَاَیْتُ شَیْئًا اِلَّا وَرَاَیْتُ اللّٰہَ بَعْدَہٗ ''اور میں کوئی شے نہیں دیکھتا مگر اللہ مجھے اس کے بعد بھی نظر آتا ہے''۔ پہلے بھی اللہ نظر آتا ہے بعد میں بھی نظر آتا ہے۔ وَمَا رَاَیْتُ شَیْئًا اِلَّا وَرَاَیْتُ اللّٰہَ مَعَہٗ ''اور میں کوئی شے نہیں دیکھتا مگر ساتھ بھی اللہ ہی نظر آتا ہے''۔ تو گویا اس طریقے پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے حضور کی کیفیت انسان میں ہو کہ یہ کائنات غیاب میں چلی جائے۔ جیسا کہ ہم اس وقت حواس اور کائنات اور اسباب کی دنیا میں حضور رکھتے ہیں اور اللہ ہم سے غیاب کی کیفیت میں ہے۔ اللہ کو سوچ سوچ کے ذہن میں لانا پڑتا ہے تو کہتے ہیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ذکر حاوی ہو جائے اور ماسوی اللہ کو سوچ کے

لانا پڑے۔ تو یہ توحید کا اعلیٰ درجہ ہے جو انہوں نے بیان کیا‘ لیکن وہ کہتے ہیں کہ یہ تو کسی وقت انسان پر طاری سا ہو جاتا ہے۔ باقی جو جہنّم سے بچانے کے لیے شرط ہے وہ توحید کا دوسرا درجہ ہے۔ زبان سے اور دل سے اقرار اگر ہو گا تو جہنّم سے نجات ہو جائے گی‘ ان شاء اللہ۔ یہ نہیں ہے تو منہ سے چند کلمات ادا کرنے سے کچھ بھی نہیں ہوتا۔

مُحَمَّدٌ فَرْقٌ بَیْنَ النَّاسِ

اس ضمن میں ایک اہم بات یہ ہے کہ ہمارے دین کی بنیاد تو توحید ہی ہے کہ لا اِلٰہ الا اللہ ہی ہر نبی کی دعوت تھی۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ﴿۲۵﴾﴾ (الانبیاء)

’’اور ہم نے آپؐ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اُس کی طرف یہی وحی کرتے تھے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں‘ پس میری ہی بندگی کرو۔‘‘

لیکن ہمارے علماءِ عقیدہ نے ایمان اور کفر کی بنیاد توحید کو نہیں رکھا۔ یعنی یہ نہیں کہا کہ ایمان ہے توحید کو مان لینا اور کفر ہے توحید کا انکار کر دینا۔ اگرچہ یہ بات فی نفسہٖ درست ہے‘ لیکن توحید کے دعویدار اور توحید کے مطالب ایک سے زیادہ پائے جاتے ہیں۔ یہود بھی کہتے ہیں کہ ہم موحد ہیں‘ نصاریٰ بھی یہی کہتے ہیں اور ہندوؤں کے اوپر والے طبقات سے پوچھیں گے تو وہ بھی یہیں کہیں گے کہ ہم بھی موحد ہیں۔ تو گویا توحید تو بظاہر ہے لیکن توحید کا وہ تصوّر مقصود ہے جو رسول اللہ ﷺ کے ذریعے معلوم ہوا ہے۔ علماءِ عقیدہ نے ایمان اور کفر کی بنیاد توحید پر نہیں رکھی بلکہ ایمان کی تعریف اور کفر کی تعریف یہ کی کہ رسول کی لائی ہوئی بات کو ماننا اور رسول اور اس کی لائی ہوئی بات کا انکار کرنا‘ یہ ایمان اور کفر ہے۔ تو اس پر بھی بہت زیادہ توجہ کی اس لیے ضرورت ہے کہ آج کل بہت سے لوگ ایسے نظریات کا پرچار کر رہے ہیں کہ اصل شے توحید ہے اور توحید پر جوڑنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ان کے نزدیک یہ سب توحیدی (Monotheistic) مذاہب ہیں اور وہ اسی context میں اس آیت کو بھی استعمال کرتے ہیں:

﴿قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۶۴﴾﴾ (آل عمران)

’’(اے نبی ﷺ!) کہہ دیجیے: اے اہلِ کتاب! ایک بات کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان برابر ہے کہ سوائے اللہ کے کسی اور کی بندگی نہ کریں اور اُس کا کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور سوائے اللہ کے کوئی کسی کو ربّ نہ بنائے۔ پس اگر وہ پھر جائیں تو کہہ دو گواہ رہو کہ ہم تو فرماں بردار ہونے والے ہیں۔‘‘

علماء نے کہا کہ توحید ہی مقصود ہے‘ لیکن وہ توحید مقصود ہے جو رسول اللہ ﷺ کے واسطے سے پہنچی ہے‘ لہٰذا ایمان کی تعریف کی گئی: تصدیقُ الرسولِ فی کل ماجاء به من الدین ضرورتا۔ یعنی اللہ کے نبی کی تصدیق کرنا اور اُس کی جو بھی آپ لے کر آئے ہیں دین میں سے۔ اس میں توحید بھی ہے۔ اور اسی طرح کفر ہے: تکذیب

الرسولِ‘ جو شے رسول لے کر آئے ہیں‘ جو آپ سے لانا تواتر ا اور ضرورتاً ثابت ہے‘ اس کی تکذیب کرنا کفر ہے اور اس کو ماننا ایمان ہے۔ توحید دین کی بنیاد ہے لیکن کفر اور اسلام میں فرق رسول پر ایمان اور عدم ایمان سے ہوگا۔ جیسا کہ بخاری کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ سو رہے تھے اور دو فرشتے آپؐ کے پاس آئے۔ ایک نے کہا: اِنَّهٗ نَائِمٌ یہ سو رہے ہیں۔ دوسرے نے کہا کہ اِنَّ الْعَیْنَ نَائِمَةٌ وَالْقَلْبُ یَقْظَانِ آپ ﷺ کی آنکھیں سو رہی ہیں مگر دل جاگ رہا ہے۔ اور پھر ایک مثال بیان کی رسول اللہ ﷺ کی اور پھر آخر میں فرمایا کہ وَمُحَمَّدٌ فَرَقٌ بَیْنَ النَّاسِ۔ اور اس کی ایک روایت یہ بھی ہے کہ و محمدا فَرَقَ بین الناس۔ یعنی اب تفریق محمد ﷺ کریں گے۔ محمد ﷺ سے فرق ہوگا کہ کون مسلمان ہے کون مسلمان نہیں ہے۔ جو آپ پر ایمان رکھتا ہے مسلمان ہے‘ جو نہیں رکھتا وہ مسلمان نہیں ہے۔ تو اب تفریق لوگوں میں توحید سے قائم نہیں ہوگی‘ تفریق قائم ہوگی رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ عالیہ سے۔

دورِ حاضر کا ایک بڑا فتنہ

اس پر بھی بہت توجہ کی ضرورت ہے‘ کیونکہ آج کل کے جو فتنے ہیں ان میں ایک بہت بڑا فتنہ یہ بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی دین میں جو حیثیت ہے اس کو کسی نہ کسی طریقے پر کم کیا جائے۔ تو اس کی بہت سی شکلیں ہیں۔ کبھی وہ بین المذاہب مکالمہ میں ظاہر ہوتی ہیں‘ کبھی وہ استخفاف بالحدیث میں ظاہر ہوتی ہیں‘ کبھی وہ انکار حدیث میں ظاہر ہوتی ہیں۔ کبھی ہمیں یہ فلسفے سننے کو ملتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانا بھی ضروری نہیں رہا اور رسول اللہ ﷺ پر ایمان لائے بغیر انسان موحد بھی ہوسکتا ہے اور مومن بھی ہوسکتا ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ کی دعوت تمام نوعِ انسانی کے لیے نہیں ہے‘ وغیرہ وغیرہ۔ تو اس طرح تمام باتیں کفر کے قریب پہنچی ہوئی ہیں اور انسان کو کفر کی حدود میں داخل کر دیتی ہیں۔ یہ دین کے مسلّمات کا انہدام ہے۔ یعنی جس کو یہ نہیں معلوم کہ رسول اللہ ﷺ کی دعوت تمام نوعِ انسانی کے لیے ہے اور رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانا ہر اُس شخص پر واجب اور فرض ہے کہ جس تک آپ ﷺ کی دعوت پہنچی ہے‘ اس کو ابھی اسلام کی الف ب نہیں معلوم۔ وہ کس پر ایمان لایا ہے؟ یعنی کس نبی پر ایمان لایا ہے؟ تو رسول اللہ ﷺ کی دعوت عالمی ہے۔ آپ ﷺ نے خود فرمایا مسلم کی روایت میں کہ چھ چیزیں ہیں جن میں مجھے دوسرے نبیوں پر فضیلت دی گئی۔ ان میں سے ایک ہے کہ ((کَانَ النَّبِیُّ یُبْعَثُ اِلٰی قَوْمِهٖ خَاصَّةً وَاُنَا بُعِثْتُ اِلَی النَّاسِ کَافَّةً)) ”ہر نبی اپنی قوم کی طرف مبعوث ہوتا تھا اور میں تمام انسانوں کی طرف بھیجا گیا ہوں“۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا ﴿۵۶﴾﴾ (الفرقان)

”اور نہیں بھیجا ہم نے آپ (ﷺ) کو مگر بشیر اور نذیر بنا کر۔“

اور:

﴿قُلْ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعَا ۨ الَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ

وَالْاَرْضِ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۠ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۸﴾ (الاعراف)

''(اے نبی ﷺ!) کہہ دیجیے اے لوگو! مَیں اللہ کا رسول ہوں تم سب کی طرف (اُس اللہ کا) جس کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے' اُس کے سوا کوئی معبود نہیں' وہی زندہ رکھتا ہے اور وہی موت وارد کرتا ہے۔ تو ایمان لاؤ اللہ پر اور اُس کے رسول پر جو نبی اُمی ہے' جو ایمان رکھتا ہے اللہ پر اور اُس کے سب کلاموں پر' اور اُس کی پیروی کرو تا کہ تم ہدایت پاؤ۔''

آپ ﷺ کی شریعت تمام شریعتوں کو منسوخ کر چکی ہے۔ اللہ کے ہاں برحق توحید وہ ہے جو رسول اللہ ﷺ نے بتائی ہے۔ توحید کے حوالے سے یہ چند بنیادی باتیں تھیں جو عرض کر دی گئیں۔

مباحثِ عقیدہ (۸)

ہم یہ بات جان چکے ہیں کہ توحید ہمارے دین کی معراج ہے اور توحید ہی اصل ہے' لیکن ایمان اور کفر میں فرق اب توحید کی بنیاد پر نہیں' بلکہ اللہ کے نبی ﷺ پر ایمان لانے کی بنیاد پر ہے۔ کسی بھی عقیدہ کی کتاب اٹھا کے دیکھیں گے تو اس میں کفر کی تعریف آپ کو یہ نہیں ملے گی کہ توحید کا انکار کرنا ہمارے دین میں کفر ہے' بلکہ آپ کو ہر جگہ یہی تعریف ملے گی کہ اللہ کے رسول کی تکذیب کر دینا کسی ایسی شے میں جس کا لانا رسول اللہ ﷺ سے تواتر کے ساتھ ثابت ہو۔ اور اگر کسی ایسی شے میں تکذیب ہو جس کا لانا اللہ کے رسول ﷺ سے تواتر کے ساتھ یا ضرورتاً ثابت نہیں ہے تو پھر تکفیر نہیں ہوگی تفسیق ہو جائے گی' وہ شخص فاسق قرار پائے گا۔ یعنی کوئی شخص خبر واحد کا انکار کرتا ہے' بخاری و مسلم کا انکار یا کسی ایک حدیث کا تو ہم کہیں گے کہ اس نے بڑا غلط کام کیا اور یہ فاسق و فاجر ہے۔ لیکن چونکہ وہ خبر واحد ہے اور اس کا ثبوت اللہ کے نبی ﷺ سے علی سبیل القطع نہیں ہے' ظن غالب کے درجے میں ہے' لہٰذا اس کا انکار کفر تک نہیں پہنچائے گا' بلکہ ایسے شخص کو فاسق اور بدعتی قرار دیا جائے گا۔ کفر یہ ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ کی تکذیب' آپ ﷺ کی لائی ہوئی اُس بات میں جو آپ ﷺ سے تواتر کے ساتھ ثابت ہو۔ اب یہ بات ضروری نہیں ہے کہ عقیدے کی ہو۔ اگر یہ بات عمل کی بھی ہوگی تب بھی کفر ثابت ہو جائے گا' جیسے نماز پڑھنا عقیدہ نہیں ہے لیکن نماز کی فرضیت کا اعتقاد عقیدہ ہے۔ اگر کوئی کہے کہ پانچ نمازیں نہیں ہیں یا فرض نہیں ہیں یا چار ہیں یا تین ہیں تو ایسا شخص بھی مسلمان قرار نہیں دیا جائے گا' کیونکہ اس نے اُس شے کا انکار کیا جو معلوم من الدین بالضرورۃ ہے۔ یقیناً معلوم ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ اس کو لے کر آئے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کی بعثت عمومی کا انکار کفر ہے

جس طرح نماز کی فرضیت دین میں ضرورتاً معلوم ہے اسی طرح دین میں یہ بات بھی ضرورتاً معلوم ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ کی بعثت تمام انسانوں کے لیے ہے۔ جس طرح نماز کی فرضیت تواتر سے ثابت ہے اسی طرح اللہ کے

رسول ﷺ کی بعثت تمام انسانوں کے لیے‘ بھی تواتر سے ثابت ہے۔جس طرح نماز کی فرضیت کا انکار کفر ہے یا توحید کا انکار کفر ہو جائے گا یا اور کسی اعتقادی معاملے کا‘ اسی طرح اگر کوئی شخص رسول اللہ ﷺ کی شریعت کو ناسخ قرار نہ دے یا آپ ﷺ کی بعثت کو عمومی قرار نہ دے‘ یا کچھ لوگوں کے لیے آپ ﷺ پر ایمان لانا ضروری قرار نہ دے تو ایسا شخص بھی اصلاً دین سے خارج ہو جاتا ہے‘ اس نے کفر کا ارتکاب کیا۔لیکن بہرحال کافر قرار دینا ہم جیسے لوگوں کا کام نہیں ہے‘ علماء ہی دیکھیں گے کہ اس پر حُجّت تمام ہوئی یا نہیں اور تمام شرائط اور موانع دور ہو چکے ہیں یا نہیں؟ پھر وہ کفر کا فتویٰ اس کے اوپر لگائیں گے۔لیکن اس بات کو کفر کہنے میں عامی کو بھی اشکال نہیں ہونا چاہیے۔یعنی اگر کسی عام آدمی سے بھی پوچھا جائے کہ تمہارے خیال میں اللہ کے نبی ﷺ کی رسالت تمام لوگوں کے لیے ہے اور اس پر ایمان لانا ضروری ہے اور کیا اس کو نہ ماننا کفر ہے؟ تو اس کو بھی کوئی اشکال نہیں ہونا چاہیے کہ وہ کہے کفر ہے‘ کیونکہ یہ بات معلوم من الدین بالضرورہ ہے جس میں عام اور خاص دونوں برابر ہوتے ہیں۔ہاں کفر کا حکم شخص واحد پر لگانے میں دونوں برابر نہیں ہوں گے‘ وہ علماء کا کام ہے‘ عوام الناس کا کام نہیں ہے۔البتہ اس بات کو کفر کہنا عوام کا کام بھی ہے اور انہیں بھی معلوم ہونا چاہیے کہ یہ بات کفر ہے۔رسول اللہ ﷺ کی بعثت عمومی ہے جو نص قرآنی سے ثابت ہے۔

مسلمانوں میں اصل توحید میں اختلاف نہیں ہے

توحید کے معاملے میں ایک بات ذہن میں رکھیے کہ مسلمانوں میں توحید کے حوالے سے اختلاف نہیں ہوا۔بظاہر کچھ اختلافات نظر آتے ہیں‘ جیسے ایک عمل شرک ہے یا نہیں؟ اس میں دو رائیں ہو سکتی ہیں۔کچھ لوگ کہتے ہیں فلاں عمل شرک ہے اور کچھ لوگ کہتے ہیں کہ نہیں۔تو کیا یہ توحید اور شرک میں اختلاف ہو گیا؟ توحید تو ہمارے دین کی بنیاد ہے تو توحید میں کیسے اختلاف برداشت کیا جا سکتا ہے۔یہ تو اس کے مانند ہو گیا کہ قرآن میں کوئی اختلاف آجائے کہ قرآن کی یہ آیت قرآن ہے یا نہیں ہے؟ یہ اختلاف تو مسلمانوں کے ہاں قابلِ قبول نہیں ہے۔تو کس طریقے پر توحید میں وارد ہونے والا اختلاف ہمارے ہاں قابل قبول ہے؟ اس کو مختصراً سمجھنے کی ضرورت ہے کہ ہمارے ہاں جو توحید میں اختلاف ہے وہ یہ اختلاف نہیں ہے کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت جائز ہے یا نہیں ہے؟ یعنی توحید میں اختلاف اُس وقت ہو گا اگر مسلمانوں میں کوئی فرقہ ایسا کھڑا ہو جائے جو یہ دعویٰ کرے کہ ہمارے خیال میں غیر اللہ کی عبادت بھی ہو سکتی ہے تو اب یہ اصل میں اختلاف ہو گیا۔جہاں تک یہ اصل ہے کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہیں ہو سکتی‘ اس میں مسلمان متفق ہیں‘ یعنی کسی بھی ایسے آدمی سے آپ جا کے پوچھیں گے کہ جو بظاہر ایسے اعمال کر رہا ہے جن کو شرکیہ سمجھا جاتا ہے کہ تمہارے خیال میں اللہ کے سوا کسی کی عبادت کر سکتے ہیں؟ تو وہ کہے گا کہ نعوذ باللہ! اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہیں ہو سکتی۔پھر آپ پوچھیں گے کہ تم کیوں کر رہے ہو؟ تو وہ کہے گا کہ جس کو تم عبادت کا فعل سمجھ رہے ہو وہ عبادت کا فعل نہیں ہے‘ یہ ہمارے ہاں عبادت نہیں شمار ہوتی۔پھر اس کے وہ دلائل دے گا۔تو اصل میں تو ابھی اختلاف نہیں ہوا کہ غیر اللہ کی عبادت نہیں ہو سکتی۔

ہاں اس اصل کے نیچے کچھ فروعات ہوتی ہیں۔ بہت سی فروع ایسی ہیں جن پر اتفاق ہے' کچھ کے بارے میں یہ اختلاف ہے کہ یہ اس اصل کے تحت داخل ہوتی ہیں کہ نہیں۔ اس اختلاف کی گنجائش ہوسکتی ہے۔ مثال کے طور پر جیسے ہمارے ہاں ایک مسئلہ ہوتا ہے کہ کسی نے غیر اللہ کو مدد کے لیے پکار لیا تو شرک ہوگیا یا نہیں ہوا؟ کچھ لوگ کہہ رہے ہیں نہیں ہوا' کچھ کہہ رہے ہیں کہ ہوگیا۔ اور کچھ کہہ رہے ہیں کہ شرکِ اکبر ہوگیا۔ شرکِ اکبر ہوگیا تو اس کا مطلب ہے کہ وہ بندہ دین سے خارج ہوگیا۔ اس دنیا میں خروج کا حکم نہیں لگا تو آخرت میں تو خارج ہی ہے نا' کیونکہ شرکِ اکبر تو آخرت میں معاف ہو ہی نہیں سکتا۔ تو اس کی بنیاد پر مسلمانوں کی تکفیر بھی ہوئی کہ فلاں فلاں لوگ شرک کرتے ہیں' کیونکہ ان کے ہاں غیر اللہ کو پکارنے کا رواج ہے اور بہت سے لوگوں کا قتل عام بھی ہوا۔ تو اب یہ اصل کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہیں ہوسکتی یہ تو متفق علیہ ہے۔ لیکن اللہ کے سوا کسی کو پکارا جانا ایک خاص اعتبار سے کیا یہ اس اصل کے تحت ہے یا نہیں ہے' اس میں اختلاف ہوسکتا ہے۔ جمہور علماء کا موقف ہے کہ اللہ کے سوا محض کسی کو پکار لینا شرک نہیں ہوتا' بلکہ ایک اعتقاد کے ساتھ پکارنا شرک ہوتا ہے۔ یعنی ایک خاص اعتقاد اس کے پیچھے ہوگا تو وہ شرک بنتا ہے' محض عمل پکار شرک نہیں ہوتا۔ ایک گروہ نے کہا کہ اعتقاد وغیرہ کا تو کوئی اعتبار ہی نہیں ہے' محض پکار لینا شرک ہے اور شرک اکبر ہے۔ یہ ایک شاذ رائے ہے اور اس کی وجہ سے اکثر مسلمانوں کے متعلق ان کے ہاں تکفیری رجحانات پیدا ہوئے۔

شرک اصلاً اعتقادی ہوتا ہے

عمومی موقف یہ ہے کہ کوئی فعل ایک خاص اعتقاد کے ساتھ شرک بنتا ہے' کیونکہ شرک اصلاً اعتقادی ہوتا ہے' عملی اصلاً نہیں ہوتا۔ کچھ اعمال شرکیہ اس لیے ہوتے ہیں کہ شریعت نے ان اعمال کی دلالت اعتقاد پر حتمی شمار کی ہوتی ہے۔ کوئی شخص مشرک اس وقت ہوتا ہے جب غیر اللہ کے بارے میں وہ اعتقاد قائم کرلے جو اعتقاد صرف خدا کے بارے میں ہونا چاہیے۔ چنانچہ اصلاً تو شرک اعتقادی ہوتا ہے۔ پھر از روئے شریعت ہمیں یہ معلوم ہوا کہ کچھ اعمال ایسے ہوتے ہیں کہ جو صراحتاً دلالت کرتے ہیں اعتقاد پر اور وہاں ہم ان اعمال کو قائم مقام اعتقاد سمجھتے ہیں۔ مثال کے طور پر کوئی شخص گلے میں صلیب لٹکائے پھر رہا ہے بغیر کسی اقرار کے' بغیر کسی جبر کے' تو اب ہم جا کے اس سے نہیں پوچھیں گے کہ آپ کا اعتقاد کیا ہے؟ شریعت کہہ رہی ہے کہ اس طرح کے محض اعمال بغیر کسی جبر کے اعتقاد پر دلالت کرتے ہیں۔ ایسا شخص مسلمان شمار نہیں ہوگا۔ کوئی شخص بت کے سامنے مندر میں جا کے ماتھا ٹیک کے سجدہ کر رہا ہے' یہاں اعتقاد کا سوال نہیں ہوگا کہ تم نے بت کو کس اعتقاد کے تحت سجدہ کیا؟ کیونکہ بُت غیر اللہ کی عبادت کا مرکز ہے' مظہر ہے' شعائر میں سے ہے' وہاں جا کے نیت کا اعتبار نہیں ہوگا۔ تو کچھ اعمال اعتقاد پر دلالت کر رہے ہوتے ہیں' لہٰذا وہ شرک ہوتے ہیں' اس وجہ سے نہیں کہ وہ عمل ہوتے ہیں بلکہ اس وجہ سے کہ ان کی دلالت اعتقاد پر قطعی ہوتی ہے۔ کیا صرف غیر اللہ کو پکارنا اس طرح کا عمل ہے کہ جس کی دلالت اعتقاد پر فوری ہوجائے گی؟ علماء نے کہا: نہیں ہوگی' بلکہ کچھ شرائط اور اعتقادات کے ساتھ ہوگی۔ اور ایک اعتقاد یہ ہے کہ غیر اللہ میں تاثیر

کا عقیدہ رکھ لے۔ اگر غیر اللہ میں اس نے تاثیر کا عقیدہ رکھ کر پکار لیا تو شرک ہو جائے گا اور اگر پکارا لیکن غیر اللہ میں کسی قسم کا اعتقاد نہیں تھا تو شرک نہیں ہے۔ اب یہ بات کہ حرام تھا یا حلال تھا؟ یہ ایک الگ مبحث ہے اور شرک اور کفر ہونا ایک الگ مبحث ہے۔ تو ہر حرام شے شرک نہیں ہوتی۔ کچھ دوسرے لوگوں نے جنہوں نے شاذ پوزیشن اختیار کی انہوں نے کہا نہیں! جس نے منہ سے یہ کلمہ نکالا یا کہہ کر کسی کو پکار لیا وہ مشرک ہو گیا۔ انہوں نے معاملے کو دقیق طریقے پر نہیں سمجھا۔ قرآن میں ہے کہ یہ غیر اللہ کو پکارتے ہیں لیکن قرآن نے ساتھ یہ بھی بتایا کہ وہ غیر اللہ کے بارے میں اعتقاد کیا رکھتے ہیں۔ اور قرآن مجید نے تو کوئی فرق نہیں کیا' پکارنا تو لفظ مطلق ہے' جو بھی اللہ کے سوا پکارے گا۔ تو ہم پکار تو رہے ہوتے ہیں چاہے اسباب کی دنیا میں' قرآن نے تو اسباب اور غیر اسباب میں بھی فرق نہیں کیا' وہ تو ہم نے فرق کیا' ہم نے کہیں نہ کہیں پہنچ کر تخصیص کر لی اور پکارنے کی گنجائش تو رکھی۔ لہٰذا اس اعتبار سے مسئلے کو سمجھنا چاہیے کہ یہ اس طرح کے مسائل نہیں ہیں کہ ہم جا کر لوگوں پر حکم لگاتے پھریں۔

مسلمانوں کے بارے میں توحید اور شرک پر گفتگو کرتے ہوئے ہاتھ ہلکا رکھنا چاہیے اور اس میں Judgemental نہیں ہونا چاہیے اور حتمی فیصلے نہیں دے دینے چاہئیں کہ فلاں شخص مشرک ہو گیا۔ عموماً عوام الناس میں اس طرح کے اعتقادات ہیں جو واقعی شرکیہ ہوتے ہیں لیکن پھر بھی ہم ان کو ان کی جہالت کی وجہ سے مشرک نہیں کہہ سکتے۔ ان کو کسی نے بتایا نہیں ہوتا' وہ سمجھ رہے ہوتے ہیں کہ شاید یہی دین ہے۔ اگر انہیں جا کر بتایا جائے اور انہیں بات سمجھ آ جائے تو شاید وہ رک بھی جائیں۔ لہٰذا ہم ان کے اعمال کو شرکیہ کہہ سکتے ہیں۔ بغیر اس کے کہ ہم انہیں مشرک قرار دے کر خارج از دین قرار دیں۔ یہ بات بھی ہمیں سمجھ لینی چاہیے کہ مسلمانوں کے وہ گروہ جو اہل سُنّت کے دائرے کے اندر ہیں ان میں اصلاً یہ اختلاف نہیں ہو سکتا کہ شرک جائز ہو جائے۔ اہل سُنّت کے نزدیک وہ مسلمان نہیں ہو سکتا کہ جو غیر اللہ کی عبادت کو جائز قرار دے۔ بہر حال یہ کچھ وضاحت تھی جو میں نے چاہا کہ کر دی جائے۔ اور ان شاء اللہ موقع ملا تو آئندہ ہم دیکھ لیں گے کہ تکفیر وغیرہ کے اصول کیا ہیں جو علماء نے بیان کیے ہیں۔

تکفیرِ مطلق و تکفیرِ معیّن

ایک قاعدہ اسی ضمن میں یہ ہے کہ تکفیر مطلق تکفیر معیّن کو لازم نہیں ہوتی۔ بس یہ قاعدہ ہم عوام الناس کو سمجھ لینا چاہیے' کیونکہ ہم کئی دفعہ اس میں فرق نہ کرنے کی وجہ سے سمجھتے ہیں کہ جب کسی عمل کو کفر کہا ہے تو کرنے والا لازماً کافر ہے۔ یعنی ایک عمل اگر چوری ہے تو کرنے والا چور ہے' ایک عمل زنا ہے تو کرنے والا زانی ہے' یہ منطقی بات ہے۔ لیکن ایک عمل کفر ہے مگر کرنے والے کو کافر نہیں کہا جا سکتا' تو یہ بات ہم جیسوں کو سمجھ نہیں آتی۔ یہ سمجھ لینا چاہیے کہ تکفیر نہایت محتاط عمل ہے' لہٰذا تکفیر مطلق اور معیّن میں فرق رکھا گیا ہے۔ ہو سکتا ہے ایک عمل کفر ہو لیکن کرنے والے کو ہم کافر نہیں کہہ سکتے' کیونکہ اس کو کافر کہنے کے لیے کچھ شرائط درکار ہیں۔ وہ شرائط ابھی پوری نہیں ہو رہیں۔ تو کسی عمل کو کفر کہنا تکفیر مطلق ہے اور کرنے والے شخص کو کافر کہنا تکفیر معیّن ہے۔ قاعدہ ہے کہ تکفیر مطلق تکفیر معیّن کو لازم نہیں۔ یہ نہیں کہہ رہے کہ تکفیر مطلق کبھی بھی تکفیر معیّن کو لازم نہیں ہو گی۔ ہو بھی سکتی ہے دلائل کے ساتھ۔ لیکن ہم یہ بھی نہیں

کریں گے کہ رواداری میں آ کے کسی عمل کو کفر کہنا‘ شرک کہنا یا بدعت کہنا یا فسق کہنا چھوڑ دیں۔ مگر تکفیر مطلق کو معیّن تک پہنچانا ہمارا کام نہیں ہے‘ وہ وہی کریں گے جو ماہرین ہیں‘ جو دیکھ سکتے ہیں‘ جو حُجّت تمام کر سکتے ہیں‘ جو شرائط و موانع کو پیش نظر رکھ کر بتائیں گے کہ فلاں شخص کافر ہو گیا یا نہیں۔ اور یہ اصلاً ہماری تاریخ میں قاضی کا کام ہوتا تھا۔ مفتی بس فتویٰ دیتا تھا۔ مفتی کا حکم لازم نہیں ہوتا تھا کہ لاگو ہو جائے۔ جس کا فیصلہ لاگو ہو گا وہ قاضی ہے۔ قاضی کے پاس اتھارٹی ہے‘ وہ بتائے گا کہ اس بنیاد پر اب یہ کافر ہے تو اب سٹیٹ یا خلافت اسے کافر سمجھے گی۔

تکفیر کا مطلب تکفیر عنداللہ ہونا نہیں

اس ضمن میں آخری بات یہ ہے کہ کسی کی جب تکفیر کی جا رہی ہوتی ہے‘ یعنی فلاں شخص کافر ہے تو علماءِ کلام یا عقیدہ نے بہت عمدہ بات بیان کی ہے کہ تکفیر کا مطلب تکفیر عنداللہ ہونا ضروری نہیں۔ یعنی جب علماء کہتے ہیں کہ فلاں شخص کافر ہے تو وہ اپنے علم اور جو بھی ان تک تواتر سے بات پہنچی ہے اس کے اعتبار سے اس شخص پر حکم لگا رہے ہوتے ہیں کہ یہ شخص مسلمان نہیں ہے‘ یہ اسلام کے دائرے سے باہر ہے۔ لیکن کچھ ایسے موانع اور عذر ہو سکتے ہیں جس کو نہ کوئی مفتی جان سکے‘ نہ قاضی جان سکے‘ نہ کوئی بشر جان سکے‘ وہ صرف ربّ البشر ہی جان سکتا ہے کہ اس کے کیا حالات ہیں‘ کیا ظروف ہیں‘ کہاں پیدا ہوا‘ کتنا پہنچا‘ کتنا نہیں پہنچا‘ کیسا اس کا دماغ تھا‘ دماغ کام بھی کر رہا تھا یا نہیں کر رہا تھا وغیرہ۔ تو ہمارے کافر کہنے سے ضروری نہیں ہے کہ وہ عنداللہ بھی کافر قرار پائے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی وجہ سے عنداللہ معذور قرار دے دیا جائے۔ تو ہم جب کافر کہتے ہیں تو وہ کافر عنداللہ ہوتا ہے‘ کافر عنداللہ ہونا ضروری نہیں ہے۔ ہو بھی سکتا ہے‘ لیکن ضروری نہیں ہے۔ ہاں جو کافر عنداللہ حتمیت کے ساتھ ہم جانتے ہیں وہ وہی ہے جس کے بارے میں اللہ نے بتا دیا یا اللہ کے رسول ﷺ نے بتا دیا۔ جیسے ابولہب ہے تو وہ کافر عنداللہ حتماً ہے۔ ابوجہل کافر عنداللہ حتماً ہے۔ باقی جن کے بارے میں ہم نہیں جانتے ہم ان کو کافر کہتے ہیں‘ مگر ان کا فیصلہ قیامت کے دن اللہ ہی فرمائے گا۔ ہم ان کے لیے استغفار بھی نہیں کریں گے‘ کیونکہ ہمیں یہی حکم دیا گیا ہے‘ ان کا جنازہ بھی نہیں پڑھیں گے۔ اگر وہ زندہ ہیں تو ان کے ساتھ شادی بیاہ کا تعلق بھی نہیں ہو گا۔ یہ سب احکام جو فقہ اور شریعت کے ہیں وہ لاگو ہوں گے‘ لیکن قیامت کے دن فیصلہ اللہ نے کرنا ہے۔ یہ ہمارے پاس اختیار نہیں کہ ہم اسے جہنّم میں پہنچا دیں۔ یعنی ہم کہیں کہ ہم نے اسے کافر قرار دیا لہٰذا یہ ابدی جہنمی ہے۔ یہ ہم شخص واحد کے متعلق نہیں کہہ سکتے‘ ہاں عموماً اطلاق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں۔ ہم کہیں گے کافر ابدی جہنمی ہے۔ لیکن پھر ہم یہاں سے استخراج نہیں کریں گے کہ کافر جہنمی ہے‘ فلاں کافر ہے‘ لہٰذا فلاں ابدی جہنمی ہے۔ جنتی کی بات بھی یہی ہے۔ یہاں تک کہ تعیین کے ساتھ (یہ اکثر علماء کا قول ہے) کسی نابالغ بچے کو بھی جنتی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ہم یوں کہیں گے کہ نابالغ بچے جنّت میں ہوتے ہیں‘ ان شاء اللہ یہ بھی جنّت میں ہو گا۔ اللہ کے نبی ﷺ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو یہی تعلیم فرمایا تھا کہ جب ایک بچی فوت ہو گئی تو سیدہ عائشہؓ نے فرمایا: عصفور من عصافیر الجنّۃ ’’جنّت کی چڑیوں میں سے ایک چڑیا ہے۔‘‘ تو اللہ کے نبی ﷺ نے ان سے پوچھا: ((وما ادراک؟)) (صحیح مسلم) تمہیں کس نے بتایا؟ یعنی تمہیں

یہاں اس طرح تعین کے ساتھ نہیں کہنا چاہیے۔ ہاں یوں کہو کہ اللہ سے امید یہی ہے بچے جنّت میں ہیں۔ مسلمان فوت ہو جائے‘ لوگ اس کے متعلق اچھی گواہی دے رہے ہیں تو‘ ان شاء اللہ‘ قوی اُمید ہے کہ وہ جنّت میں ہوگا۔ لیکن اس کی تعیین ہمارا کام نہیں ہے۔ ہم عشرہ مبشرہ اور اسی طریقے پر بہت سے غیر عشرہ مبشرہ جن کو روایات میں خوشخبری دی گئی ہے ان سب کے متعلق یقین رکھتے ہیں کہ وہ جنّت میں ہیں‘ کیونکہ ان کے بارے میں نص وارد ہوگئی۔ تو اب ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ ابوبکر فی الجنۃ‘ عمر فی الجنۃ‘ عثمان فی الجنۃ‘ علی فی الجنۃ۔ طلحہؓ‘ زبیرؓ‘ سعد بن ابی وقاص‘ عبدالرحمٰن بن عوف وغیرہم من الصحابۃ کہ جن کے بارے میں اللہ کے نبی ﷺ نے جنّت کی خوشخبری دی ہے‘ یقیناً جنت میں ہیں۔ باقی سب کے بارے میں ہمیں اچھی اُمید ہے‘ جیسا کہ صحابہؓ کے بارے میں فرمایا گیا: وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى سب سے اللہ تعالیٰ نے جنّت کا وعدہ کیا ہوا ہے۔ تو ہر وہ صحابی جن سے نفاق کا ظہور نہیں ہوا ان کے بارے میں ہمیں امید ہے کہ وہ جنّت میں ہیں اور ان کے بارے میں مجموعی حکم یہی ہے۔

مَنْ صَمَتَ نَجَا

یہ کچھ اصول ہیں جو ہمیں توحید‘ شرک اور تکفیر کے حوالے سے پیش نظر رکھنے چاہئیں اور اپنی زبانیں ہمیں بند کر لینی چاہئیں۔ آج کل چونکہ زبانیں کھولنے کا دور ہے اور زبانیں کھولنے کے مواقع بہت موجود ہیں‘ کہیں بھی بیٹھ کر ہم زبان کھول سکتے ہیں۔ انٹرنیٹ‘ فیس بک‘ سوشل میڈیا اور یوٹیوب پر اپنا چینل بنا کر جو بولنا ہے بولتے چلے جائیں۔ تو زبان کھولنے کے مواقع اتنے زیادہ ہیں کہ اب بغیر سوچے سمجھے جو منہ میں آئے بولتے چلے جا رہے ہیں۔ کسی کو کیا کہہ دیا‘ کسی کو کچھ کہہ دیا۔ کوئی اخلاق نہیں ہے‘ کوئی تربیت نہیں ہے اور علم بھی کوئی نہیں ہے۔ ہم لوگوں کے لیے فی زمانہ ایک بہت اہم نصیحت یہ ہو سکتی ہے کہ اپنی زبانیں بند رکھیں۔ یعنی مَنْ صَمَتَ نَجَا مسلمانوں کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے جو خاموش رہا وہ نجات پا جائے گا۔ یہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے منقول ایک جملہ ہے۔ بس اس پیرائے میں اس مسئلہ کو سمجھنا چاہیے کہ میں غلطی سے سو کافروں کو مسلمان قرار دے دوں‘ یہ ہلکی بات ہے بنسبت اس کے کہ میں غلطی سے ایک مسلمان کو کافر قرار دے دوں۔ ایک مسلمان کو کافر قرار دینا بہت بڑی بات ہے۔ اس شخص کی غلطی قابل قبول ہو سکتی ہے جو واقعی مجتہد ہو‘ جو حکم لگانے کا اہل ہو‘ جب وہ غلطی پر بھی پہنچے گا تو اس کے لیے ایک اجر ہے۔ صرف معذور نہیں ہے بلکہ ماجور بھی ہے! لیکن ہم لوگ چونکہ مجتہد نہیں ہیں‘ ہم تو کسی بھی درجے یا کھاتے میں نہیں آتے۔ ہم تو معذور بھی نہیں ہوں گے‘ ماجور ہونا تو دور کی بات ہے۔ لہٰذا ہم جیسے لوگوں کے لیے زبان بند کر لینا ضروری ہے۔ اور یہ ایک مجاہدے کا کام ہے‘ کیونکہ زمانہ زبان کھولنے کا ہے‘ بولنے کا ہے‘ چپ ہونے کا نہیں ہے۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی بولے چلے جا رہا ہے‘ لکھے چلے جا رہا ہے‘ سب کے پاس ایک پورا نظامِ فکر موجود ہے۔ کسی سے پوچھا جائے کہ دنیا کی اصلاح کیسے ہوگی؟ وہ کہے گا میں بتاتا ہوں کیسے ہوگی۔ وہ یہ نہیں کہے گا کہ واقعی گمبھیر صورت حال ہے پتا کچھ نہیں چل رہا‘ بلکہ اُس کے پاس اصلاح کا پورا نظامِ فکر اور عملی سٹریٹیجی موجود ہے۔

میرے سامنے ایسی مثالیں موجود ہیں کہ کچھ لوگوں کو بولنے کا بہت شوق تھا‘ ان کے سامنے آئیڈیل شخصیات

تھیں جو داعیٔ دین کا کام کرتی ہیں‘ ان کو دیکھ کر وہ کہتے تھے کہ ہم بھی اس طرح کے داعی دین بننا چاہتے ہیں۔ میں نے ایک صاحب کو کہا کہ داعی بننے کے لیے کچھ پڑھنا بھی پڑے گا‘ کچھ علومِ دین حاصل کرنا ہوں گے۔ وہ کہنے لگے کہ پھر تو یہ لمبا سفر ہے‘ یعنی اس کے بغیر ہی داعی بنا جائے تو بہتر ہے۔ چنانچہ وہ داعی بن گئے۔ اس کے بعد میں نے فیس بک پر دیکھا کہ ان کے لیکچرز آن لائن ہو رہے تھے۔ چونکہ ان کو انگریزی اچھی بولنی آتی ہے اس لیے انہوں نے اپنا ایک داعیٔ دین کا امیج بنالیا۔ لیکن مجھے معلوم ہے کہ ان کو ابھی کچھ بھی نہیں پتا ہے لیکن وہ داعیٔ دین بن چکے ہیں۔ اس وقت ایک عجیب سا فتنہ ہے کہ ہم نے دین کی خدمت کرنی ہے۔ خدمت کرنا تو بڑی اچھی بات ہے‘ خدمت تو کرنی چاہیے‘ لیکن خدمت مشہور ہو کر ہی کرنی ہے؟ خدمت کرنے کے لیے مشہور ہونے کی شرط کہاں سے آ گئی؟ یہ تو شیطان کی لگائی ہوئی شرط ہے‘ اسلام کی نہیں۔ دین کی خدمت تو بڑے طریقوں سے ہو سکتی ہے‘ تم نے اسی طرح کرنی ہے جس طرح فلاں کر رہا ہے۔ وہ مشہور ہو گیا تو ہم بھی مشہور ہو جائیں اور ہمارے بھی یوٹیوب پر ویڈیوز آنا شروع ہو جائیں اور چینلز کھل جائیں۔ یہ تو حظِ نفس ہے یعنی نفس کے مزے ہیں۔ پھر آپ دیکھیں عجیب وغریب نمونے سامنے آ رہے ہیں۔ اس وقت دنیا کے ایک بہت بڑے داعی کا ایک انٹرویو میں نے سنا۔ ان سے انٹرویو والا عربی میں پوچھ رہا تھا اور اس کا ترجمہ انگریزی میں ہو رہا تھا۔ ان سے پوچھا گیا کہ آپ نے دنیا میں دین پھیلایا لیکن آپ نے عربی زبان کیوں نہیں سیکھی؟ تو انہوں نے اقرار کیا کہ میں نے ایک دو دفعہ کوشش کی لیکن نہیں سیکھ سکا۔ وہ پوری دنیا میں دین کی خدمت کرنے کے لیے مشہور ہو چکے ہیں لیکن انہوں نے واضح طور پر بتا دیا کہ میں نے عربی کبھی نہیں سیکھی۔ اور وہ داعی دین ہیں۔ یعنی اس طرح کا تصور کبھی آپ سوچ سکتے تھے کہ ایک شخص دین کی زبان سے واقف نہ ہو لیکن پوری دنیا میں اس کا دین کے داعی کا امیج ہو۔ یہ بڑی عجیب وغریب صورت حال ہوتی جا رہی ہے اور اس میں ہمیں محتاط رہنا چاہیے۔ یعنی دین کے کچھ بنیادی علوم سیکھنا ضروری ہیں‘ ورنہ انسان یا تو نفس کے پھندے میں آ جائے گا یا پھر ایسی الٹی سیدھی باتیں کرنا شروع کر دے گا‘ کیونکہ مشہور ہونے کے لیے کئی دفعہ کچھ منفرد باتیں کرنی پڑتی ہیں‘ ورنہ اگر وہی باتیں دہراتے چلے جائیں جو چودہ سو سال سے چلی آ رہی ہیں تو لوگ کہیں گے کہ یہ تو روایتی قسم کے مولوی ہیں‘ ان کو کچھ پتا ہی نہیں ہے۔ چنانچہ پھر آپ اپنے کلام میں کچھ انفرادیت لے کر آتے ہیں‘ نئی باتیں لے کر آتے ہیں اور پھر آپ کی گڈی چڑھنی شروع ہوتی ہے۔

عقیدۂ طحاویہ

اگلی صفات پر جانے سے پہلے خواہش ہے کہ امام ابوجعفر الطحاوی علیہ الرحمہ نے ان صفات کے بارے میں جو لکھا ہے اس کا بھی حوالہ آ جائے‘ کیونکہ یہ طریقہ جو میں نے بتایا ہے صفات کی تقسیم کا یہ متاخرین کا ہے جب کہ امام طحاوی علیہ الرحمہ متقدمین میں شمار ہوتے ہیں۔ متاخرین کے ہاں ایسے بات شروع ہوئی جیسے عقیدے کی کتابوں میں ہوتا ہے کہ صفات کی اتنی اقسام ہوتی ہیں اور پھر ہر ایک پر الگ الگ منظم طریقے سے گفتگو ہوتی ہے۔ یہ طریقہ متقدمین کا نہیں تھا‘ کسی بھی علم میں نہیں تھا۔ جیسے امام شافعی علیہ الرحمہ کا ''الرسالہ'' کھول کے دیکھیں جو اصولِ

فقہ پر پہلی کتاب شمار ہوتی ہے تو وہ آپ کو بعد میں لکھی جانے والی اصول فقہ کی کتابوں کی جو ترتیب ہے اس سے بالکل مختلف نظر آئے گی۔ یہاں بھی آپ دیکھیں گے کہ امام طحاوی علیہ الرحمہ نے یہ ساری باتیں بیان کی ہیں مگر اپنے انداز اور ترتیب میں۔ امام ابوجعفر الطحاوی حنفی المذہب تھے اور یہ وہ حنفی المذہب تھے جو فقہ شافعی سے فقہ حنفی میں آئے تھے' امام مزنی کے شاگرد تھے۔ ۲۳۰ھ میں پیدائش ہوئی ہے اور ۳۲۰ھ میں وفات ہوئی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

هٰذا ذكر بيان عقيدة أهل السنة والجماعة' على مذهب فقهاء الملة : أبي حنيفة النعمان بن ثابت الكوفي ، وأبي يوسف يعقوب بن ابراهيم الانصاري، و أبي عبد الله محمد بن الحسن الشيباني رضوان الله عليهم أجمعين : وما يعتقدون من أصول الدين، و يدينون به ربّ العالمين۔ ان الله واحدا لا شريک له ولا شيء مثله ولا شيء يعجزه ولا اله غيره' قديم بلا ابتداء ' دائم بلا انتهاء' لايفنى ولا يبيد' ولا يكون الا ما يريد' لا تبلغه الاوهام ' ولا تدركه الافهام' ولا يشبه الانام' حي لا يموت ' قيوم لا ينام' خالق بلا حاجة' رازق بلا مؤنة' مميت بلا مخافة ' باعث بلا مشقة' ما زال بصفاته قديما قبل خلقه' لم يزدد بكونهم شيئا لم يكن قبلهم من صفاته' وكمَا كان بصفاته ازليا كذلک لا يزال عليها ابديا ليس بعد خلق الخلق استفاد اسم الخالق ولا باحداث البرية استفاد اسم الباري له معنى الربوبية ولا مربوب' ومعنى الخالقية ولا مخلوق' وكمَا انه محيي الموتى ما احيا استحق هذا الاسم قبل احياءهم' كذلک استحق اسم الخالق قبل انشائهم ذلک بانه على كل شيء قدير۔

''یہ اہلِ سنّت والجماعت کے عقیدہ کا بیان ہے، جسے ملت اسلامیہ کے فقہائے عظام امام ابوحنیفہ نعمان بن ثابت' امام ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم اور امام ابوعبداللہ محمد بن حسن شیبانی رحمہم اللہ [1] کے طریقے پر ذکر

(۱) امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف کو ''شیخین'' کہتے ہیں۔ امام ابو یوسف اور امام محمد ہوں تو یہ ''صاحبین'' ہو جاتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ اور امام محمد ہو جائیں تو ان کو ''طرفان'' کہتے ہیں۔ ''اصحابِ ثلاثہ'' میں یہ تینوں آ جاتے ہیں۔ اور پھر اس کے بعد دو مزید امام ہیں۔ امام زفر اور امام زیاد بن حسن اللولئی۔ امام زفر کے قول پر کم فتویٰ ہوتا ہے لیکن سترہ مسائل فقہاء احناف نے بیان کیے ہیں جن میں فتویٰ نہ امام ابوحنیفہ کے قول پہ ہے نہ صاحبین کے قول پر ہے' بلکہ امام زفر علیہ الرحمہ کے قول پر ہے۔ تو یہ بزرگانِ دین ہیں۔ آج کل اتنا بیوقوفی کا دور ہے کہ کچھ بھی پتا نہیں ہوتا۔ یعنی اگر آپ فقہ حنفی کی ترتیب یا کسی بھی فقہ کو پڑھیں گے تو آپ کو پتا چلے گا کہ کیا باریکیاں ہیں' کن مسائل میں کس کے قول پر فتویٰ ہوتا ہے' اصحابِ ترجیح کون ہیں' اصحابِ تخریج کون ہیں' کچھ بھی نہیں پتا اور بیٹھے رائے دے رہے ہوں گے اچھا امام ابوحنیفہ نے یہ کہا ہے' امام ابو یوسف نے تو یہ کہا ہے۔ تو دیکھا امام ابو یوسف نے اختلاف کیا' ہم امام ابو یوسف کے ساتھ ہیں! پچھلے دنوں فقہ حنفی کے اصولوں پر ایک کتاب پڑھنے کا اتفاق ہوا تو جو وہاں دقت اور گہرائی ہے ◀◀

کیا جاتا ہے۔ انہی باتوں کا دین کے اصول کے طور پر وہ عقیدہ رکھتے تھے اور ربّ العالمین کے بارے میں ان کا یہی دین و ایمان تھا۔ اللہ کی توفیق سے ہم توحید باری تعالیٰ کے بارے میں اپنا عقیدہ بیان کرتے ہیں۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ ایک ہے' اس کا کوئی شریک نہیں۔ (توحید سے آغاز کیا جو صفاتِ سلبیہ میں سے ہے) کوئی شے اس کی مثل نہیں (اس بات کا ذکر بکثرت آئے گا' کیونکہ امام صاحب کے زمانے میں کرامیہ فرقے کا ظہور ہو چکا تھا جن کے ہاں تجسیم کے کچھ اثرات موجود تھے)(۲) کوئی شے اسے عاجز کرنے والی نہیں اور اُس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ قدیم ہے' اس کی کوئی ابتدا نہیں (قدم جو صفاتِ سلبیہ میں سے ہے) وہ دائمی ہے' اس کی کوئی انتہا نہیں (صفت بقا) وہ فنا ہونے اور مٹنے والا نہیں۔ دنیا میں وہی کچھ ہوتا ہے جس کا وہ ارادہ کرتا ہے (صفت ارادہ صفات معانی میں سے ہے' اس کو ہم دیکھیں گے' ان شاءاللہ!) انسانی وہم و فکر اس کی حقیقت کو نہیں پا سکتے اور نہ ہم اس کی ذات کا ادراک کر سکتے ہیں (لیس کمثلہ شیء کا بیان چل رہا ہے) وہ مخلوق کے مشابہ نہیں' وہ زندہ ہے اسے موت نہیں آئے گی۔ وہ محافظ ہے اسے نیند نہیں آتی (صفت قیومیت)۔ وہ خالق ہے بغیر کسی حاجت کے (اللہ کا مل ہے عمل تخلیق اس کے کمال کا اظہار ہے سبب نہیں)۔ بدون کلفت وہ سب کو روزی دیتا ہے' وہ بے خوف و خطر سب کو موت دینے والا ہے اور دوبارہ اٹھائے گا بغیر مشقت کے۔ وہ اپنی جمیع صفاتِ کمالیہ سے تخلیق عالم سے قبل ہی متصف تھا (یعنی تخلیق مخلوقات سے اس کی صفات میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوئی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ تمام مخلوقات مسبوق بالعدم ہیں، یعنی اللہ تھا اور کوئی نہیں تھا۔ یہاں سے قدم نوعی کے اس عقیدے کا بھی رد ہوتا ہے جسے بعض لوگ عقیدہ سلف کے نام پر پیش کرتے ہیں) مخلوقات کی تخلیق سے اس کی صفات میں ایسی کوئی چیز زیادہ نہیں ہوئی جو پہلے نہ تھی۔ وہ جس طرح اپنی صفات کے ساتھ ازل سے ہے اسی طرح ان صفات سے ابد تک متصف رہے گا (جیسے ازل میں کامل تھا لایزال (ہمیشہ) بھی کامل رہے گا) خالق کی صفت سے اس کا اتصاف بعد از تخلیق نہیں (اگر اتصاف بعد از تخلیق ہو تو اللہ ایک صفت کمال میں مخلوق کا محتاج ہو گیا اور وہ احتیاج سے منزہ ہے) اسی طرح باری کی صفت سے اتصاف بریت (مخلوق) کو پیدا کرنے کے بعد سے نہیں اس کے لیے صفت ربوبیت

◀◀ کس طریقے پر کہاں کیا فتویٰ دیا جاتا ہے اور کہاں کس کے قول کو ترجیح ہے۔ قضاء کا مسئلہ ہوگا تو امام ابو یوسف کا قول مرجع ہوگا۔ عبادات کا مسئلہ ہوگا تو امام ابوحنیفہ کے قول پر ہوگا۔ اگر امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف جمع ہو جائیں تو انہی کے قول پر ہوگا' وغیرہ وغیرہ۔ یہ بہت سے اصول ہیں۔ اور پھر اصحاب ترجیح اور تخریج ایک پوری سائنس ہے۔

(۲) کرامیہ نامی فرقے کے بہت سے عقائد ایسے ہیں کہ جن کو آج کل سلف کے نام سے پیش کر دیا جاتا ہے۔ یعنی سلف کا عقیدہ کیا ہے فلاں فلاں مسئلے میں' وہ عقیدہ اصلاً کرامیہ کا ہوتا ہے۔ اور کرامیہ وہ ہیں کہ جن کے اندر جراثیم تجسیم ہیں۔ تو امام صاحب بار بار نفی کریں گے۔ اور عجیب بات ہے جن لوگوں نے سلف کے نام پر عقیدہ طحاویہ کی شرح کرنے کی کوشش کی' جیسے ابوالعز الحنفی تو اس میں ان کو جگہ جگہ بتانا پڑتا ہے کہ امام طحاوی سے یہاں غلطی ہو گئی۔ امام طحاوی کا یہ مسلک ٹھیک نہیں ہے۔ یہ فلاں فلاں فلسفے اور اعتزال سے متاثر ہو گئے ہیں۔ یعنی اب ہر جگہ کچھ نہ کچھ ترمیمات اور بریکٹس لگانی پڑتی ہیں۔ اللہ کے فضل سے ہم نے جتنی باتیں کی ہیں اور جو اہلِ سنّت کا عقیدہ ہے اس میں یہاں کہیں آپ کو بریکٹ لگانے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ ہر بات صاف اور وثوق سے کہی گئی ہے۔

ثابت تھی جبکہ کوئی مربوب نہ تھا۔ وہ خالق تھا جب کوئی مخلوق نہ تھی۔ جس طرح کسی مردے کو زندہ کرنے کی وجہ سے اسے ''مُحیی'' کہا جاتا ہے اسی طرح اس نام سے وہ زندہ کرنے سے قبل بھی متصف تھا۔ خالق کا نام بھی تخلیق سے قبل ہی اس کو حاصل تھا۔ اور یہ سب کچھ اس لیے کہ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

اس کے بعد تھوڑا سا آگے جا کر کہتے ہیں:

ومن وصف اللّٰہ بمعنی من معانی البشر فقد کفر' فمن ابصر۔ ھذا اعتبر' وعن مثل قول الکفار انزجر' وعلم انہ بصفاتہ لیس کالبشر۔

''اور جو کوئی اللہ تعالیٰ کو انسانی صفت و حالت سے متصف کرے وہ کفر کرتا ہے۔ پس جس شخص نے یہ سمجھ لیا اُس نے اعتبار حاصل کر لیا اور وہ کافروں والی باتیں کرنے سے بچ گیا اور اُس نے جان لیا کہ حق تعالیٰ اپنی صفات میں کسی انسان کے مشابہ نہیں۔''

آگے کہتے ہیں:

ومن لم یتوق النفی والتشبیہ زل و لم یصب التنزیہ' فان ربنا جل وعلا موصوف بصفات الوحدانیۃ' منعوت بنعوت الفردانیۃ ' لیس فی معناہ أحد من البریۃ

''جو شخص حق تعالیٰ کی صفات کی نفی کرنے سے اور ان کو مخلوق کے مشابہ قرار دینے سے نہ بچا وہ گمراہ ہوا اور تنزیہ کے راستے پر نہ چلا۔ باری تعالیٰ یکتائی صفات سے متصف اور منفرد اوصاف کے حامل ہیں' مخلوق میں کوئی ان جیسی صفات والا نہیں۔'' (ہم یہ جان چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ منزہ ہے حدود سے' غایات سے' اعضاء سے' آلات سے' جہات سے وغیرہ۔ امام طحاویؒ نے بھی بالکل اسی طریقے پر تنزیہ کا بیان کیا اور تشبیہ کی کامل نفی کی جو اہل سُنّت کا طرۂ امتیاز ہے۔)

الٰہیات' نبوات' سمعیات

عقیدے کو ہمارے علماء نے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے: الٰہیات' نبوات اور سمعیات۔ ان تین حصوں میں عقیدے کے مباحث کو تین موضوعات یا تین عنوانات کے تحت تقسیم کیا جاتا ہے' وہ ہیں: واجبات' مستحیلات اور جائزات۔ ہماری جو گفتگو ابھی تک ہوئی وہ سب الٰہیات میں شامل ہے۔ اس کے بعد ہم نبوات پر منتقل ہوں گے اور پھر اللہ نے چاہا تو سمعیات پر بھی جائیں گے۔ الٰہیات یہ ہے کہ ہم جانیں کہ کیا چیزیں اللہ کے لیے واجب ہیں۔ اللہ پر واجب کچھ نہیں ہوتا یا اللہ کے لیے کچھ واجب ہوتا ہے؟ اللہ کے لیے واجب ہونے کا مطلب ہے کہ وہ کیا صفات ہیں کہ جس میں پائی جائیں گی وہی واجب الوجود ہو' اور اگر ان صفات میں سے کوئی رہ جائے تو وہ خدا نہیں ہوگا کچھ اور ہوگا۔ واجب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ یہ کون سی صفات اللہ کے لیے واجب ہیں۔ ابھی تک جتنی صفات ہم پڑھ چکے ہیں اور جو آئندہ پڑھیں گے سب اللہ کے لیے واجب ہیں۔ یعنی اگر آپ یہ صفات اللہ میں نہیں مانیں گے تو آپ جس خدا کو مان رہے ہیں وہ محمد رسول اللہ ﷺ کا بتایا ہوا خدا نہیں ہے۔ الٰہیات میں تین چیزیں دیکھتے ہیں: کیا صفات اللہ کے لیے واجب ہیں؟ کیا اُس کے حق میں مستحیل ہیں اور کیا جائز ہیں؟ مستحیل کا مطلب ہے کہ ہو ہی

نہیں سکتیں؟ اور اگر ہوں گی تو وہ خدا نہیں ہوگا' جیسے کوئی بھی نقص۔ واجبات وہ ہیں کہ جن کا اللہ کے بارے میں اعتقاد رکھنا ہمارے لیے واجب ہے۔ مستحیلات وہ ہیں کہ جن کے بارے میں یہ اعتقاد رکھنا ضروری ہے کہ یہ یہ ثابت نہیں ہوسکتیں۔ جائزات وہ ہیں جن کا کرنا نہ کرنا اللہ کے لیے برابر ہو۔ مثال کے طور پر مخلوق کا پیدا کرنا' اللہ کے لیے واجب تھا یا مستحیل تھا یا جائز؟ یقیناً جائز تھا۔ اللہ چاہتا تو نہ کرتا۔ تو خلق کی نسبت اللہ کی طرف ہے' لیکن یہ اللہ کے اللہ ہونے کے لیے ضروری نہیں ہے کہ بالفعل مخلوق موجود ہو۔ مخلوق کے پیدا کرنے پر قدرت یقیناً واجب ہے' لیکن مخلوق کا پیدا کرنا جائز ہے۔ یا نبی کو بھیجنا اللہ کے لیے ضروری ہے کہ نبی کو بھیجے؟ نہیں' بلکہ اللہ کا فضل ہے۔ رسول کا بھیجنا جائز ہے اللہ کے حق میں' چاہے تو نہ بھیجے چاہے تو بھیج دے۔ اسی طرح اور بھی بہت سی صفات ہیں۔

اللہ پر کچھ واجب نہیں

اہلِ سُنّت کا مسلک یہ ہے کہ اللہ پر واجب کچھ نہیں ہوتا۔ ابھی جیسے میں نے کہا رسول کا بھیجنا یا نہ بھیجنا اللہ کی مرضی ہے۔ بھیج دے تو اللہ کی مرضی اور اُس کا فضل ہے۔ معتزلہ جو ایک گمراہ گروہ تھا' انہوں نے کہا اللہ کے لیے رسول بھیجنا واجب ہے۔ ان کے ہاں ایک وجوب کا تصوّر ہے کہ اللہ پر کچھ چیزیں ضروری ہوتی ہیں۔ انہوں نے اس کے تحت بہت سے تصوّرات بیان کیے ہیں' ان میں سے ایک تصوّر یہ ہے کہ اللہ کے لیے ضروری ہے کہ لوگوں کی ہدایت کا انتظام کرے۔ یعنی رسول بھیجنا ضروری ہے' واجب ہے۔ اس کو کہتے ہیں وجوب اصلح یا وجوب الصالح۔ لیکن اہلِ سُنّت اللہ پر کچھ واجب نہیں ٹھہراتے کہ یہ نتیجہ ہے اللہ کے غلط تصوّر کا۔ اللہ کی تنزیہہ اور عدمِ احتیاج کو جو اہلِ سُنّت نے بیان کیا ہے وہ اللہ کے فضل سے کسی نے نہیں کیا۔ جب ہم ارادے کی بحث پڑھیں گے تو آپ کے سامنے یہ بات آجائے گی کہ اللہ پر کوئی جبر نہیں ہوتا۔ نبوات میں بھی ہم یہی چیزیں نبی کے حق میں پڑھتے ہیں یعنی واجبات' جوائز اور مستحیلات۔ نبی میں کیا چیز ماننا ضروری ہے؟ کیا شے اس میں نہیں ہوسکتی اور کیا شے اس کے لیے جائز ہے؟ پھر ایک اضافی مبحث ہوتا ہے نبی کی تعریف کیا ہے اور نبوت کی ضرورت کیا ہے؟ اور اس میں پھر ہم الٰہیات کی اس بحث سے کہ نبی کی بعثت اللہ کے لیے امورِ جائزہ میں سے ہے' داخل ہوتے ہیں۔

پھر نبوات کے باقی مباحث آتے ہیں۔ سمعیات ہیں کہ نبی آ گیا اور نبی کی حقانیت ثابت ہوگئی۔ اب نبی جو بتائے گا اس پر ایمان رکھنا واجب ہوتا چلا جائے گا۔ آخرت' قیامت' حساب کتاب' میزان' عذابِ قبر' آنے والے دور کی خبریں وغیرہ' یہ سب سمعیات ہیں کہ جو نبی کے بتانے سے ہمیں معلوم ہوتی ہیں اور ان پر بھی ایمان رکھنا ضروری ہے۔ اس میں تقسیم ضرور کی جائے گی کہ کیا شے تواتر کے ساتھ ثابت ہے اور کیا تواتر کے ساتھ ثابت نہیں ہے۔ تو یہ تین چیزیں ہیں جس کے تحت پورا عقیدہ بیان کیا جاتا ہے۔ ہم مباحث عقیدہ میں الٰہیات اور الٰہیات میں بھی واجبات کے ضمن میں مختلف موضوعات پر ابتدائی گفتگو کرتے آرہے ہیں۔

صفاتِ وجودیہ اور صفات سلبیہ ہم پڑھ چکے ہیں۔ آئندہ ہم صفاتِ معانی کے حوالے سے کچھ بنیادی باتیں کریں گے۔ اس میں مستحیلات ضمناً آئے جارہے ہیں' جیسے ہم نے توحید کہا تو اب کثرت اللہ کے حق میں مستحیل

ہوگئی۔ مخالفہ للحوادث‘ کہا تو مشابہہ للحوادث مستحیل ہوگئی۔ اللہ قدیم ہے تو عدم قدم اللہ کے حق میں مستحیل ہوگیا۔ گویا مستحیلات مستقل آرہے ہیں‘ لیکن عنوان استحالہ کا نہیں ہے بلکہ عنوان وجوب کا ہے۔ صفات معانی میں کسی معنی (meaning) کا اثبات ہورہا ہے یعنی صفت کا اثبات ہورہا ہے اللہ کے حق میں‘ کسی صفت کی نفی نہیں ہورہی۔ اس میں سات یا آٹھ صفات ہیں‘ ایک اختلاف کے ساتھ کہ اشاعرہ اور ماتریدیہ کے درمیان ہے۔ آئندہ ان شاء اللہ ہم ’’قدرت‘‘ سے بحث کا آغاز کریں گے۔

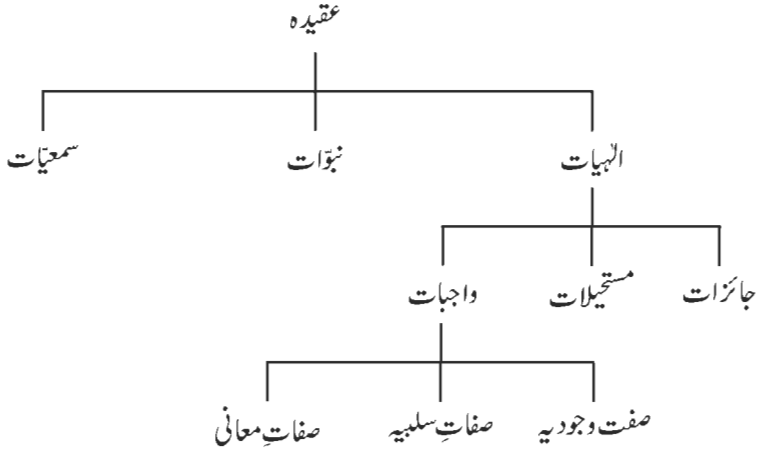

بقیہ: اسلام اور سائنس

نظریاتی غیر جانبداری یا بے یقینی انسان کے لیے ناممکن ہے۔ انسان کا دل کبھی کسی معبود یا خُدا کے بغیر نہیں رہ سکتا اور انسان کوئی عمل ایسا نہیں کرسکتا جو اُس کے دل سے سرزد نہ ہو۔ جب سچّے خُدا کا عقیدہ انسان کے دل سے ہٹ جائے تو اسی وقت کسی جھوٹے خُدا کا متبادل عقیدہ اس کی جگہ لے لیتا ہے۔ اگر انسان کا کوئی عمل (خواہ اس کی نوعیت روحانی ہو یا علمی‘ اخلاقی یا جمالیاتی) سچّے خُدا کے عقیدے کے ماتحت سرزد نہ ہو تو وہ کسی جھوٹے خُدا کے عقیدہ کے ماتحت سرزد ہوتا ہے اور غلط ہوتا ہے۔ اسی لیے قرآن کی تعلیمات کے مطابق بتوں سے عملی کفر کرنا خُدا پر عملی ایمان لانے کی لازمی شرط ہے۔

﴿فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۗ لَا انْفِصَامَ لَهَا ؕ﴾ (البقرۃ:۲۵۶)

’’جو شخص طاغوت سے کفر کرے اور اللہ پر ایمان لائے وہ ایک ایسے مضبوط حلقہ کو گرفت میں لیتا ہے جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔‘‘

ہر قسم کے بتوں سے انکار خُدا کے اقرار کی ایک ایسی شرط ہے جو انسان کی فطرت نے اس پر عائد کر رکھی ہے۔ اس سے گریز سائنسدان کے لیے سائنسی تحقیقات اور تعلیمات کے میدان میں بھی ممکن نہیں۔ (جاری ہے)

MESSAGE OF THE QUR'AN

Translation and Brief Elucidation

By

Dr. Israr Ahmad

Surah Al-A'raf

(The Heights)

(Recap of verses 11 – 31 of Surah 7, Al-A'raf and exposition of verses 32 – 47 of the same Surah, inclusive)

Translator's note:

For the sake of continuity and coherent explanation, most of the general discourse has been made by employing the 'male' as a prototype, which is in no way meant to be diminutive of the opposite gender or to disrespect the status of women.

Moreover, each verse (Verse) has been kept as a continuum in order to prevent the misrepresentation of meanings, which may occur when the verses are broken up and the translation of those verses becomes kaput when done in bits and pieces.

Cross-references taken from other parts of the Qur'an and the Hadith of the Messenger of Allah (SAAW) are provided in italics.

The Translation of the Holy Qur'an done by the Message International – USA (www.FreeQuran.com) and edited by Saheeh International – UK, Dar Al Mountada – Saudi Arabia and Al Qummah – Egypt has been used in order to synchronize the use of modern English Language, which we believe will give a more accomplished sense of understanding to Today's mind.

Recap of verses 11 – 31 (inclusive) of Surah 7, Al-A'raf

This section of Surah 7, Al-A'raf (Verses 11 through 31) commences with introduction to the event of the creation of Adam *(AS)* and that Allah *(SWT)* commanded the angels to prostrate before Adam *(AS)* and they all obeyed their Lord *(SWT)* except *Iblees* (who was in fact a Jinn). *Iblees* rejected the command of Allah *(SWT)* and did not prostrate to Adam *(AS)*. The text makes it very clear that prostration before Adam *(AS)* was in his *(AS)* capacity as the representative of all mankind and not in his *(AS)* personal capacity. Therefore, "man" is Allah's *(SWT)* Vicegerent on earth. Furthermore, the real reason for the rebellion of *Iblees* against Allah *(SWT)* and, by extension, against all humans is further elucidated. The Jinn are created from fire whereas Allah *(SWT)* created the body of humans from clay. The Jinn are similar to humans in the manner that both are required to worship Allah *(SWT)* and follow Islam and both are given the free-will to exercise, therefore, like humans they may either be obedient or disobedient to their Creator *(SWT)*. Thus, when Allah *(SWT)* commanded *Iblees* (a Jinn) to prostrate before Adam *(AS)*, he became arrogant and jealous from the superiority given to the humans as he only saw the lower side of the man (clay) and failed to see the higher side (soul), therefore, he refused to obey and rejected Allah's *(SWT)* command. This verse explicates that the rebellious nature and arrogance of *Iblees* (Satan) earned him nothing but the wrath of Allah *(SWT)* and was thrown out of the Paradise.

Iblees (Satan) implored Allah *(SWT)* to grant him life till the Last Day so that he can prove that these humans whom Allah *(SWT)* has chosen above him and all other creations, are disobedient to Allah *(SWT)*. Thus, Allah *(SWT)* gave him (*Iblees*) respite till the Day of Judgment. *Iblees* (Satan) became a staunch enemy to Adam *(AS)* and his *(AS)* progeny and is always planning to mislead them from the right path. This is the basis of the struggle between good and evil, truth and falsehood, with *Iblees* and his followers on one side and the Allah's *(SWT)* servants on the other. The sheer misguided character of *Iblees* (Satan) stems from his arrogance, vanity and jealousy. Instead of recognizing that it was he who was in error, *Iblees* was adamant

that Allah *(SWT)* had misguided him! Not only that, but the eternally accursed Satan falsely insisted that as Allah *(SWT)* "misguided" him, expelled him from the Paradise and has denied His *(SWT)* Mercy, hence he would leave no stone unturned to misguide Allah's *(SWT)* servants, i.e., the progeny of Adam *(AS)* till the appointed time (The Hour), thus leaving for himself no chance of redemption whatsoever. It is further expounded that *Iblees*(Satan) went on to blaspheme beyond that by vowing that he would (try to) mislead (all of) Allah's *(SWT)* servants from all sides and directions by raising doubts in them about their beliefs and causing confusion in their religion, thus luring them to the path of evil, away from the Right Path. *Iblees*added that most of humans will not show gratitude to Allah *(SWT)* but will follow their desires and the evil ways that he will lure them towards. Thus, *Iblees*blasphemously challenged Allah *(SWT)* out of vanity, jealousy and arrogance, as his heart and fate had been sealed by then. At the same time, it has also been made quite clear that Satan was not granted the power to lead men into error against their will. Thus, all that Satan can do is to cause misunderstanding, to make people cherish false illusions, to make evil and error seem attractive, and to invite people to evil ways by holding out to them the promise of immense pleasure and material benefits. He would have no power, however, to forcibly pull them to the Satanic way and to prevent them from following the Right Way. Allah *(SWT)* also declares that whoever amongst the offspring of Adam *(AS)* will follow Satan and his evil ways, then he will surely be thrown into the Hellfire in the Hereafter.

It is elucidated in this section of Surah 7, Al-A'raf (Verses 11 through 31) that Allah *(SWT)* allowed Adam *(AS)* and Eve *(AS)* to reside in this Paradise for a while in order to test them and show them a glimpse of what was to come, i.e., how *Iblees*would be an enemy to them and their progeny and would try to lead them astray, and what man would get if he obeys Allah *(SWT)*. Adam *(AS)* and Eve *(AS)* were forbidden to go near a particular tree. *Iblees*plotted against Adam *(AS)* and Eve *(AS)* and suggested to them *(AS)*, with treachery, by whispering into their *(AS)* ears. *Iblees*wanted to make them *(AS)* disobey their *(AS)* Lord *(SWT)* and thus reveal to them *(AS)* the private

parts of their *(AS)* bodies that were hidden from them *(AS)* before. Therefore, he lied to them *(AS)* and told them *(AS)* that the reason that Allah *(SWT)* had forbidden them *(AS)* to eat from that tree was because He *(SWT)* did not want them *(AS)* to be like angels or live in this Paradise forever. The 'error' and 'disobedience' by Adam *(AS)* and Eve *(AS)* of Allah *(SWT)* cannot be termed as a sin or even an iota of any such intent, as it only arose from the treacherous deception and confusion caused by the cursed *Iblees* When Adam *(AS)* and Eve *(AS)* ate the forbidden fruit form the tree, the private parts of their *(AS)* bodies that were hidden from them *(AS)* prior to that were made visible to them *(AS)* and thus they *(AS)* began to cover themselves with the leaves from the trees of Paradise, i.e., using those as a dress. This also alludes to the innate modesty and purity of both Adam *(AS)* and Eve *(AS)*. Thereafter, Allah *(SWT)* reminded them *(AS)* of His *(SWT)* commandments and warnings to Adam *(AS)* and Eve *(AS)* about the enmity and hatred of *Iblees* towards them and their offspring.

This section of Surah 7, Al-A'raf (Verses 11 through 31) clearly elaborates the difference between the behaviour of Adam *(AS)* and Eve *(AS)*, as opposed to the accursed Iblees. While Adam *(AS)* and Eve *(AS)* were remorseful of their *(AS)* action and begged for Allah's *(SWT)* forgiveness and mercy for their *(AS)* slip by reciting قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ۖ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ۝ (Surah Al-A`raf, 7:23), *Iblees* remained arrogant and full of vanity even after committing blasphemy. Thus, a clear line is drawn between the way of Satan and the way that befits man. Satan's way is characterized by rebellion against Allah *(SWT)*, by arrogantly persisting in that rebellion even after having been warned, and by trying to mislead the righteously disposed towards sin and disobedience. As opposed to this, the way that befits man is to resist the evil promptings of Satan and to be constantly vigilant against Satanic machinations. But, if in spite of all these precautions, a man does swerve from the course of obedience, he should turn, as soon as he realizes his fault, to Allah *(SWT)* in penitence and remorse and make amends.

This section of Surah 7, Al-A'raf (Verses 11 through 31) declares that Allah *(SWT)* has given three kinds of clothing for the children of Adam *(AS)* to wear viz. *Libaş Rish* and *Libas of Taqwa* The verse also

elucidates that Allah *(SWT)* has revealed these 'signs' as an invitation for the people to understand. Allah *(SWT)* warns the children of Adam *(AS)* that they should guard themselves against the deception of Satan and his followers, lest, he also deceives them like he did to their parents, Adam *(AS)* and Eve *(AS)*. The verse also explicates that Satan and his followers can see and interact with the humans, while the human beings cannot see them.

Note: The three kinds of dresses mentioned above are as follows:

a) Libas: This is simple, normal but clean dress covering the body parts properly. (Al-A`raf, 7: 26)

b) Rish: An elegant dress for adornment.

c) Libas of *Taqwah*: It is the best of dresses according to Hazrat Ibn Abbas and Hazrat Urwah bin Zubair. This consists of good deeds and fear of Allah *(SWT)*. [*Ma`araf ul Quran*]

This section of Surah 7, Al-A'raf (Verses 11 through 31) also ordains to worship none but Allah *(SWT)* and face the Ka'bah during all prayers (worship). But this injunction is not limited to Prayer alone, instead it also encompasses being upright and just in all acts of worship, dealings and transactions. Allah *(SWT)* has differentiated between those who are misguided and those whom He *(SWT)* has guided on the Right path, i.e., Islam. It is elucidated that there are people whom He *(SWT)* has guided to the Straight Path while there are others who have fallen into misguidance and error because they made the satans/devils as their protectors and friends instead of Him *(SWT)*, yet they falsely think that they are on the Right Path. Allah *(SWT)* again refutes the sham custom of circumambulation around the Ka'bah while naked. Instead, Allah *(SWT)* commands the believers to present themselves in the best of their adornments when going out for prayers in the mosque, for every place of prostration is, in essence, called a *'masjid'*. This also indicates that covering oneself for *Salat* (prayer) and *Tawaf* (circumambulation) is what is meant by adorning oneself to worship Allah *(SWT)*. In conclusion, it is established that Allah *(SWT)* does not want to subject man to want and misery or starvation or to deprive him as such of the good things of this worldly life. On the contrary, it pleases Him *(SWT)* that

man should appear in good decent dress and enjoy the clean food provided for him by Allah *(SWT)*. There is nothing sinful in that. As for sin, it consists in transgressing the bounds set by Allah *(SWT)*. This transgression could be committed in both ways: by making the unlawful lawful, or by making the lawful unlawful.

==========

Expositionof verses32 – 47 of Surah Al-A'raf

Verse 32

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ۭ قُلْ هِىَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝

Say, "Who has forbidden the adornment of [i.e., from] Allah which He has produced for His servants and the good [lawful] things of provision?" Say, "They are for those who believe during worldly life [but] exclusively for them on the Day of Resurrection. Thus do We detail the verses for a people who know."

This verse is an admonishment for those who think that good dress and good food made lawful by Allah *(SWT)* is unlawful for them. Islam does not teach to live in tattered rags or torn cloths despite of having the means to adorn themselves, therefore an unkempt, dirty and slovenly *Faqir* cannot claim any 'privileged sanctity' in Islam. Instead, Allah *(SWT)* says that He *(SWT)* has provided for the believers with the best of clothing, so that they should adorn themselves and has provided for them good and pure things for food, so that they eat from them and be grateful to Him *(SWT)*. Since it is Allah *(SWT)* Himself *(SWT)* Who *(SWT)* has created all good and pure things for man, it obviously could not have been His *(SWT)* intent to make them unlawful. Now, if there is any religion, or any ethical or social system which forbids those things, or considers them an insurmountable barrier to man's spiritual growth, it has an intellectual orientation which itself is evident proof of its not having been prescribed by Allah *(SWT)*. This is an important argument which the Qur'an advances in refutation of false creeds. An appreciation of this argument would help one understand the Qur'anic line of argumentation as such.

Allah *(SWT)* commands His *(SWT)* Messenger *(SAAW)* to elucidate that even though all these blessings that He *(SWT)* has provided in this earthly life are also enjoyed by the disbelievers (other than the believers), but in the Hereafter the disbelievers will have no share in it, for *Jannah* (Paradise/Heaven) has exclusively been made for the believers. All the clean and beautiful things created by Allah *(SWT)* are meant, in principle, for the believers even in this world, for they are Allah's *(SWT)* faithful subjects, and it is fidelity to Allah *(SWT)* that makes one deserve enjoyment of the things which are Allah's *(SWT)*. However, all men are under a test in this world. Hence even those who are disloyal to Allah *(SWT)* have been granted respite to mend their ways and are, therefore, not denied His *(SWT)* worldly bounties. In fact, with a view to testing those disloyal to Allah *(SWT)* these bounties are at times lavished upon them even more abundantly than on Allah's *(SWT)* faithful servants. But the character of the Next Life will be totally different. For one's station there will be determined entirely by one's righteousness and justice. Allah's *(SWT)* bounties in the Hereafter, therefore, will be for the faithful alone. As for the unfaithful, those who were disloyal to Allah *(SWT)* even though every fibre of their being was nourished by the sustenance provided by Him *(SWT)*, they will have no share whatsoever of those bounties in the Hereafter.

The verse also declares that Allah *(SWT)* has made His *(SWT)* signs and revelations clear and abolished all the superstitions that were falsely attributed to Him *(SWT)*.

Verse 33

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

Say, "My Lord has only forbidden immoralities– what is apparent of them and what is concealed– and sin, and oppression without right, and that you associate with Allah that for which He has not sent down authority, and that you say about Allah that which you do not know."

In this verse, Allah *(SWT)* commands His *(SWT)* Prophet *(SAAW)* to enumerate and tell the idolators the things which He *(SWT)* has made

unlawful for them. The verse elucidates that Allah *(SWT)* has made unlawful to commit shameful and dishonourable deeds like adultery and fornication etcetera, whether committed openly or in secret, whether done discretely or as a profession. The verse also declares the prohibition of all kinds of wrongdoings, whether related to oneself or to the rights and dealings with others. Allah *(SWT)* sternly forbids committing *Shirk* (polytheism) i.e., taking partners with Him *(SWT)*, and attributing lies to Him *(SWT)*.

It must be noted that the word 'sin' conveys the sense of man's deliberate neglect of his duty to Allah *(SWT)*, his failure to pursue Allah's *(SWT)* good pleasure despite his having the capacity to obey and follow Him *(SWT)*. To exceed the limits set by Allah *(SWT)* and to enter an area which has been declared out of bounds for man constitute rebellion and transgression. According to this definition, the charge of rebellion will apply to all those who act according to their whims rather than in accordance with the directives of Allah *(SWT)*. It is applicable to those who behave as though they are the true masters of Allah's *(SWT)* Kingdom, claiming for themselves the *'prerogatives of God* It also applies to all those who usurp the rights of others.

Verse 34

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ ۚ فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ ۝

"And for every nation is a [specified] termSo when their time has come, they will not remain behind an hour, nor will they precede [it].

The verse commences by expounding that Allah *(SWT)* has determined a fixed term not only for every individual, but for every 'nation' too, on the face of this earth. If they do not do good and disbelieve during this time of test and 'probation', then when their term expires, they would not be given any respite even for a single moment nor will the Last Hour be delayed.

It must be noted that the expression 'fixed term' used in the verse should not give rise to the misconception that the term of a nation expires on a definite day, month or year. What the statement really means is that Allah *(SWT)* has laid down a minimum proportion between the good and evil deeds of a nation. As long as that nation is able to maintain that minimum proportion, its existence is tolerated

in order that it might be able to show its performance. Once a nation crosses that minimum limit, it is denied any further respite.

Verse 35

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ ۙ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝

"O children of Adam, if there come to you messengers from among you relating to you My verses [i.e., scriptures and laws], then whoever fears Allah and reforms – there will be no fear concerning them, nor will they grieve."

The essence of this verse is that Allah *(SWT)* has promised reward for those who, when Prophets *(AS)* of Allah *(SWT)* come to them with guidance and injunctions, listen to them *(AS)* carefully and act accordingly with piety and righteousness. Those are the ones who will be saved from sorrow and grief (in the Hereafter) and they shall have eternal peace and comfort.

Verse 36

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَآ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

"But the ones who deny Our verses and are arrogant toward them those are the companions of the Fire; they will abide therein eternally.

Adding to the message of the previous verse, this verse elucidates that on the other hand, those who reject Allah's *(SWT)* Messengers *(AS)* and disobey His *(SWT)* commandments will suffer the eternal punishment of Hellfire.

It must be noted that reference to the continuous unremitting punishment of the unbelievers occurs invariably on occasions where the Qur'an narrates the coming down of Adam *(AS)* and Eve *(AS)* from Paradise. *Ref (Al-Baqarah:Verses38-9); (Ta Ha:Verses123-4).* What has been said here should be considered in relation to the fact that at the very start of man's earthly life (at the time of Adam *AS* and Eve *AS*) he was informed of the evil results of unbelief.

Verse 37

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ۭ اُولٰۗىِٕكَ يَنَالُهُمْ نَصِيْبُهُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ ۭ حَتّٰٓى اِذَا جَاۗءَتْهُمْ رُسُلُنَا يَتَوَفَّوْنَهُمْ ۙ قَالُوْٓا اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا وَشَهِدُوْا عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ۝

"And who is more unjust than one who invents about Allah a lie or denies His verses? Those will attain their portion of the decree until, when Our messengers [i.e., angels] come to them to take them in death, they will say, "Where are those you used to invoke besides Allah?" They will say, "They have departed from us," and will bear witness against themselves that they were disbelievers."

This verse elucidates that although the disbelievers who invent lies and utter falsehood against Allah *(SWT)* and reject His *(SWT)* revelations are the most unjust people, yet they still get their due share of good things in life during the probation period in this world. But once that period expires, the angels of death will take their souls out of their bodies and they will be called to account. They will be asked about the false deities that they used to invoke and worship besides Allah *(SWT)* but soon they will realize that the same false deities have forsaken them and thus they will confess their sin and will regret of what they used to do.

All men, whether good or bad, have been granted a definite term in this world which they will spend and obtain their share of worldly happiness and misery. But the real reward or punishment would be meted on the Day of Judgement.

Verse 38

قَالَ ادْخُلُوْا فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ فِي النَّارِ ۭ كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا ۭ حَتّٰٓى اِذَا ادَّارَكُوْا فِيْهَا جَمِيْعًا ۙ قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا هٰٓؤُلَاۗءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ ۭ قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ ۝

"[Allah] will say, "Enter among nations which had passed on before you of jinn and mankind into the Fire." Every time a nation enters, it will curse its sister until, when they have all overtaken one another therein, the last of them will say about the first of them, "Our Lord, these had misled us, so give them a double punishment of the Fire." He will say, "For each is double, but you do not know."

This verse further expounds on the message regarding the reward and punishment on the Day of Judgement and details of the conversations that would take place on that Day. It must be noted that, each group of people is followed, even as it is preceded, by

others. A group which inherits an error of outlook and conduct from its predecessors passes on the same, in turn, to future generations. In addition, whereas a group owes its wrong-doing partly to the wrong-doing of its predecessors, it will also be held responsible for leaving behind an evil legacy for the future generations. The Qur'an, therefore, pronounces a double punishment on such a group: it will incur punishment for its own misdeeds and also for leaving behind such a legacy for the coming generations. A number of traditions elucidate this point. According to one such tradition the Prophet *(SAAW)* said: "He who introduces a misleading innovation which does not please Allah and His Messenger, shall be held guilty for the sins of all those who follow that innovation without lessening in the least the burden [of sins] of those who followed the innovation." (*Ibn Majah*)

According to another tradition, he *(SAAW)* said: "The responsibility for all the murders committed in the world is shared by the first son of Adam [i.e. Cain] for he was the first to have innovated murder." *(Bukhari)*

The above tradition dictates that the individual or group responsible for introducing a wrong idea or practice is not only responsible to the extent of those sins, but shares the responsibility of the sins of all those who are influenced by him. As long as the evil effects of that influence continue, their sins will be continually added to the account of the initiator. This also shows that a person is not only accountable for the good or bad deeds that he commits but he is also accountable for the influence of those deeds on others.

This may be illustrated by considering the case of someone who indulges in unlawful sex. All those who followed the bad example, induced others to indulge in a sinful activity, share the sin of all those who followed them. Were this chain of influence traced back to its originator, the blame would be fixed on the first person who initiated this unlawful way for satiating the sexual urge.

The initiation of an act of fornication by any and all those who followed him are individually accountable for the sin each committed. Each of them failed to make proper use of his capacity to distinguish between good and evil with which he had been endowed. He also did not pay due heed to the voice of his conscience, and mobilize the

power of self-control given to him. Nor did he benefit from the knowledge of good and evil transmitted to him by pious men nor was he inspired by the noble examples of the God-fearing. Nor did he learn any lesson from the evil consequences of sexual misconduct. Instead, he totally succumbed to blind sexual lust which sought gratification at all cost. This much relates to the responsibility of the person who indulged in sexual misconduct.

But there is another dimension of that person's evil conduct – his propagation of that same evil among others which ruined the lives of countless people belonging to his own generation and to the generations that follow. It is also possible that he might have been afflicted by some general disease which he then communicated to his own generation and also to the generations that followed. His sexual misconduct might also have given birth to illegitimate children, unjustly passing on the burden of their upbringing to others, and making his offspring - without any justification - co-sharers in the fortunes and even the inheritance of others. The wrong that is thus perpetrated persists for many generations. Likewise, it is also possible that the said criminal might, by his cunning, have led an innocent girl to sexually corrupt behaviour. That in turn is likely to awaken evil propensities in her which may wreck the lives and homes of countless families, even generations. Also, by setting an evil example for his children, relatives, friends and the society at large a fornicator is likely to cast a bad influence on people around him and infect others with moral corruption. The evil consequences of such an act thus linger on for a long time. The moral corruption that ultimately, engulfs the society owes its origin to the person who initially introduced an evil. Justice, therefore, demands that such a culprit should also be held responsible for the subsequent evils which may be traced back to his initial act of corruption.

The same holds true for good deeds. The reward for the heritage of goodness left behind by our predecessors from the earliest times should inevitably go to the credit of those men of the past who have continually transmitted that heritage to posterity down to our own time. If our own generation takes good care of that heritage, enriches it and passes it on to the coming generation, it also deserves due

reward for that. As long as our good acts leave a trace of good influence on history and continue to cast a good influence on people, mankind will reap the benefits of those acts.

This is the Qur'anic view of retribution. Every sensible person will agree that such a dispensation alone can ensure perfect justice. Appreciation of this concept should dispel the idea of those who believe that men can be fully rewarded or punished for their deeds within the confines of this worldly life. Likewise, such an appreciation should also dispel the views of those who believe that the transmigration of souls alone can ensure full justice to all men. The Protestants under the influence of Martin Luther believe that mere belief in Jesus Christ *(AS)* regardless of individual act is a free passport to the Heavens. Such people have blundered because they have neither grasped fully the nature and consequences of human acts nor the nature and requirements of perfect justice. The Muslims believe this world is a place for action and the Hereafter is for the reward. The human activities, both good and evil, influence the lives of countless people belonging to countless generations. One cannot, therefore, be brought to justice during one's own lifetime, since only a small part of the consequences of those acts have yet come to the surface. Moreover, the limited possibilities available in the present world are quite inadequate for bringing people to justice. Just consider the hideous crime of someone who pushes us to a world war. As things stand, the catastrophic consequences of such a crime would affect the lives of billions of men through the ages. Is there any punishment - physical, spiritual or material - which can be deemed even remotely, proportionate to that crime? Likewise, no worldly reward, however valuable, can adequately recompense for the noble services rendered by a philanthropist which will benefit numerous people for thousands of years.

Having viewed the question from this angle, one readily, concludes that there must necessarily be life in the Hereafter such that full justice can be meted out to everyone. Here all human beings are brought together, their full records are made available, and the reckoning is made by Allah *(SWT)* Himself *(SWT)* Whose *(SWT)* knowledge embraces literally everything. Additionally, men should

be granted unlimited spans of life, and infinite possibilities should be made available for receiving compensation.

A little reflection on this will help us see how false the doctrine of the transmigration of souls is. Those who subscribe to this doctrine fail to realize that eternal life is needed to mete out recompense to people for the deeds they commit during their relatively brief spans of life. If one were to believe in the unending cycle of life and death it would become impossible to reward or punish anyone for his actions, for each span of life would go on accumulating endlessly. The arrears would never be cleared.

Verse 39

وَقَالَتْ أُولَاهُمْ لِأُخْرَاهُمْ فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُونَ ۝

"And the first of them will say to the last of them, "Then you had not any favour over us, so taste the punishment for what you used to earn."

In addition to the above verse, the Qur'an elsewhere recounts the mutual incriminations of the dwellers of Hell. For example, it occurs in Surah Saba in these words: "Could you but see when the wrong-doers will be made to stand before their Lord, throwing back the word (of blame) on one another!" Those who had been abased will say to the arrogant ones:

"Had it not been for you, we should certainly have been believers!" *(Saba, 34:31)*

The arrogant ones will say, to those who had been abased:

"Was it we who kept you back from Guidance after it reached you? Nay, rather it was you yourselves who transgressed." *(Saba' 32-34).*

This means that since the misguided people themselves were not keen on receiving the right guidance, they fell victims even more to the forces of misguidance. Out of their own excessive worldliness they chose to follow their ungodly leaders. Granted that these were the forces of misguidance which had invented ideologies such as materialism, excessive worldliness, and nationalism, but when people were attracted to these false ideologies, they did so out of their own weaknesses. These forces of evil achieved success because what they

offered was to the utmost liking of the people. Again, the people who were tempted to embrace counterfeit religious ideologies were themselves to blame for falling prey to these since there was an inner urge in them to accept such ideologies. Rather than submitting to the One True God (the Glorified and the Exalted) – Allah *(SWT)* – and to rigorous moral discipline, they looked for deities that would help them to achieve their worldly purposes. Naturally, they invented deities of their own liking. They also desired the intercession of those who would let them grow in worldliness and godlessness, and yet would ensure their redemption in the Next World. As they preferred a religion that would not make their life 'a bit dry', permissive religious cult which did not object to any kind of self-indulgence were developed. This establishes clearly that the external forces of evil alone are not to blame. The people who succumb to evil and error equally share the blame. This neither condones the role of those who seek to mislead others, nor detracts from the responsibility of those who choose to be misled.

Verse 40

إِنَّ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَاسْتَكْبَرُوا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ أَبْوَابُ السَّمَاءِ وَلَا يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ حَتَّىٰ يَلِجَ الْجَمَلُ فِي سَمِّ الْخِيَاطِ ۚ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُجْرِمِينَ ۝

"Indeed, those who deny Our verses and are arrogant toward them – the gates of Heaven will not be opened for them, nor will they enter Paradise until a camel enters into the eye of a needle [i.e., never]. And thus do We recompense the criminals."

As mentioned in the exposition of the previous verses, when a nation (generation) of transgressors will be brought to the Hellfire for punishment, they will blame their previous nation (generation) for leading them astray and making them become misguided. They will implore Allah *(SWT)* to award their forefathers 'double punishment' of the Hellfire for their transgressions. Allah *(SWT)* will retort by telling them that the punishment for all (both latter and former generations) would be 'doubled'. The verse tells that those who reject and refute the revelation and verses of Allah *(SWT)* due to arrogance, haughtiness or for any other reason will not be admitted into the 'Kingdom of

Heaven' (Jannah). This decree of Allah *(SWT)* is provided further conclusiveness by using an idiom of Arabs to describe an absolute impossibility that "until a camel enters into the eye of a needle", which as we all know will never happen. The verse ends by declaring that Allah *(SWT)* will most certainly give reward and recompense, which in the case of the criminals guilty of denying Allah's *(SWT)* verses would be eternal Hellfire. It must be noted that this verse does not pertain to the believers who will be sentenced to punishment in the Hellfire for a fixed term for their sins.

Verse 41

لَهُمْ مِّنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَّمِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ۝

"They will have from Hell a bed and over them coverings [ofire]. And thus do We recompense the wrongdoers"

The metaphors of bed (of fire) and covering (of fire) for the dwellers of Hell (Jahannam) is given so that humans can relate it to their everyday experience. This verse, too, ends by declaring that Allah *(SWT)* will most certainly give reward and recompense, which in the case of the wrongdoers and guilty of denying Allah's *(SWT)* verses would be eternal Hellfire. It must be noted that this verse, too, does not pertain to the believers who will be sentenced to punishment in the Hellfire for a fixed term for their sins.

Verse 42

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَآ ۙ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

"But those who believed and did righteous deeds – We charge no soul except [within] its capacity. Those are the companions of Paradise; they will abide therein eternally."

In contrast to the dwellers of the Hellfire, the believers, who had real faith, and had done deeds, would be granted enteral life in the paradise (Jannah). That, too, is a recompense, albeit one full with the mercy and bounty of Allah *(SWT)*. In this verse Allah *(SWT)* declares that no soul is charged, with the burden of having faith and performing good deeds, beyond its capacity. It follows that on the Day of Judgement, Allah *(SWT)* will judge a soul, according to that

capacity with which it was endowed, for the verdict of Jannah or Jahannam, among other things.

Verse 43

وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ ۚ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۫ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَآ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ ۚ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۭ وَنُوْدُوْٓا اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝

"And We will have removed whatever is within their breasts of resentment, [while] flowing beneath them are rivers. And they will say, "Praise to Allah, who has guided us to this; and we would never have been guided if Allah had not guided us. Certainly the messengers of our Lord had come with the truth." And they will be called, "This is Paradise, which you have been made to inherit for what you used to do."

We are all human beings. The old adage goes like, "to err is human". Moreover, there are natural tendencies and likes and dislikes that are part of our innate nature. Therefore, if there develops any rancour or ill-will among good people during the course of their worldly lives, such rancour and ill-will will be removed in the Hereafter, before or at the time of entering Paradise. Their hearts will be purged of all hostile feelings and they will enter Paradise as cordial friends. They will not feel envious towards those who had formerly been opponents or hostile to them that they share with them the bounties of Paradise.

Reflection on the verse leads one to conclude that out of His *(SWT)* mercy, Allah *(SWT)* will first purge the righteous of their blemishes. This will be done before admitting them to Paradise. Thus, they will enter Paradise in a state of untainted purity.

The verse also denotes the fine and delicate character of those who shall inherit the Paradise. Instead of boasting about their virtuous deeds which led them to Paradise, the righteous will thank and praise Allah *(SWT)* profusely and acknowledge His *(SWT)* grace and mercy without which they could never have entered Paradise. The last part of the verse enunciates that on the other hand, Allah *(SWT)* will not impress His *(SWT)* bounty upon the righteous; He *(SWT)* will rather emphasize that Paradise is rewarded to them by way of compensation

for their righteous conduct, that it is the fruit of their hard labour; that it is not like the crumbs of charity but a fair recompense for their striving. The subtlety involved here is further brought into relief by the fact that the above response will not be made by Allah *(SWT)*. It will rather be just announced to them, by an announcer.

What is said above about the Hereafter may be discerned in the attitude of the righteous in the world itself. The wicked and arrogant ones take great pride in their worldly attainments and ascribe them to their own efforts. They firmly, believe that what they have achieved is the fruit of their labour. Swayed by such notions, they continue to act even more haughtily. Conversely the righteous look upon all the bounties which they receive as favours from Allah *(SWT)*. Accordingly, they thank and praise Allah *(SWT)* out of gratitude. The more they are lavished with worldly favours, the humbler and more generous they become. Moreover, they do not suffer from the illusion that their righteousness will certainly earn them their salvation. On the contrary, they consistently repent over their lapses and earnestly turn to Allah *(SWT)* in the hope that He *(SWT)* will pardon them out of His *(SWT)* grace and mercy. They are always fearful of Allah's *(SWT)* reckoning lest their evil deeds are found to outweigh their good deeds. According to a tradition the Prophet *(SAAW)* said: 'Know well that none will be able to enter Paradise by dint of his good deeds.' When asked if that would apply to him *(SAAW)* as well, the Prophet *(SAAW)* replied: 'Yes, in my case as well; unless Allah covers me with His mercy and favour.'

[Bukhari, Kitab alRiqaq, 'Bab alQasd wa a Mudawamah ala-Amal' - Ed.]

Verse 44

وَنَادٰٓى اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ اَصْحٰبَ النَّارِ اَنْ قَدْ وَجَدْنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَهَلْ وَجَدْتُّمْ مَّا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا ؕ قَالُوْا نَعَمْ ۚ فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَيْنَهُمْ اَنْ لَّعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ۙ

"And the companions of Paradise will call out to the companions of the Fire, "We have already found what our Lord promised us to be true. Have you found what your Lord promised to be true?" They will say, "Yes." Then an announcer will announce among them, "The curse of Allah shall be upon the wrongdoers"

The next few verses describe a dialogue that will take place after the Day of Judgement among the companions of the Paradise, the criminals in the Hellfire and people of A'raf. One of the most amazing features of the Holy Qur'an is that, as it is the Book of Allah *(SWT)*, it is not bound by our concept of time and space. Allah *(SWT)* is not bound by time (time is Allah's *SWT* creation), thus He *(SWT)* gives us a glimpse and depiction of the actual conversations that would take place in the Hereafter. This is one of such places of the Qur'an that 'quotes' conversations from the Hereafter. The first conversation is between the people of Paradise (Jannah) and the dwellers of the Hellfire (Jahannam). The former will be in the infinite mercy and boundless bounty of Allah *(SWT)*, while the latter will be in the worst possible torment. The torment of the Hellfire would be the result of the disbelief and transgression of its dwellers during the worldly life. The announcer will announce the curse of Allah *(SWT)* on the evildoers.

Verse 45

الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۚ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ كٰفِرُوْنَ ۝

"Who averted [people] from the way of Allah and sought to make it [seem] deviant while they were disbelievers, concerning the Hereafter."

This verse continues with the theme of the previous verse and explains that those transgressors in the Hellfire would be disbelievers who stop others from accepting and following the way of Allah *(SWT)* and also use various ways to build the false narrative that the verses and signs of Allah *(SWT)* are 'wrong' (The various degrees include ridiculing the believers to outrightly rejecting the existence of Allah *SWT*). The verse declares that such people do not believe in life after death and the Hereafter.

Verse 46

وَبَيْنَهُمَا حِجَابٌ ۚ وَعَلَى الْاَعْرَافِ رِجَالٌ يَّعْرِفُوْنَ كُلًّا بِسِيْمٰهُمْ ۚ وَنَادَوْا اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ ۫ لَمْ يَدْخُلُوْهَا وَهُمْ يَطْمَعُوْنَ ۝

"And between them will be a partition [i.e., wall], and on [its] elevations are menwho recognize allby their mark. And they call

out to the companions of Paradise, "Peace be upon you." They have not [yet] entered it, but they long intensely."

These few verses illustrate the landscape of the A'raf and the conditions of the Jannah and Jahannam from the view point of humans (The people of A'raf) who will be observing and comparing it first-hand. The mark of recognition, according to most exegetes of the Holy Qur'an, is the mark on the forehead formed by repeated prostration. The mode and tone in which the people of A'raf will address the people of the Paradise gives a subtle hint towards their yearning for entry into Paradise. This yearning is clearly established in the last part of the verse. The people of A'raf (Heights) will be the people who are neither righteous enough to enter Paradise nor wicked enough to be cast into Hell. They will, therefore, dwell at a place situated between the two. They will, however, most definitely be believers, i.e., Muslims.

Verse 47

وَإِذَا صُرِفَتْ أَبْصَارُهُمْ تِلْقَآءَ أَصْحٰبِ النَّارِ ۙ قَالُوْا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۧ

"And when their eyes are turned toward the companions of the Fire, they say, "Our Lord, do not place us with the wrongdoing people."

The Truth will be revealed on the Day of Judgement. The Truth about all things and no one would be in any doubt or agnosticism, let alone disbelief, on that day. The dwellers of the Hellfire will be miserable – in pain and torture – beyond any comparison that can be made in this worldly life. The people of A'raf (Heights) will be able to see their suffering and will seek the refuge of Allah *(SWT)*. When they will be made to see the people of the Hellfire, the people of A'raf (Heights) will implore Allah *(SWT)* to save them from being joined with those in the Hellfire. It is very subtly explained here that the dwellers of the Hellfire will be there because of their disbelief and transgressions, not due to some 'personal revenge'.

==========

And Allah *(SWT)* Knows Best!

سیرتِ مطہرہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے دلپذیر موضوع پر

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے فکر کا نچوڑ

سیرتِ خیر الانام علیہ الصلوٰۃ والسلام

سیرت طیبہ پر ڈاکٹر صاحب کی زندگی کے آخری خطابات کا مجموعہ

- عمدہ طباعت
- دیدہ زیب ٹائٹل
- صفحات: 240
- قیمت: 180 روپے

خود مطالعہ کیجیے
دوستوں کو تحفتاً پیش کیجیے

ملنے کا پتہ

مکتبہ خدام القرآن لاہور

قرآن اکیڈمی، 36 کے، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون: (042)35869501-03
فیکس: (042)35834000 ای میل: maktaba@tanzeem.org
ویب سائٹ: www.tanzeem.org

Quarterly
Oct - Dec 2021

HIKMAT-E-QURAN

Lahore
Vol. 40 No. 4

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان — اور — سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے علم و حکمت کی

وسیع پیمانے — اور — اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ اُمتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں تجدیدِ ایمان کی ایک عمومی تحریک برپا ہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشأۃِ ثانیہ — اور — غلبۂ دینِ حق کے دور ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ